ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

مارچ ۱۹۹۲ء

اِس شمارے کے ساتھ "جائزہ" حاصل کرنا نہ بھولئے

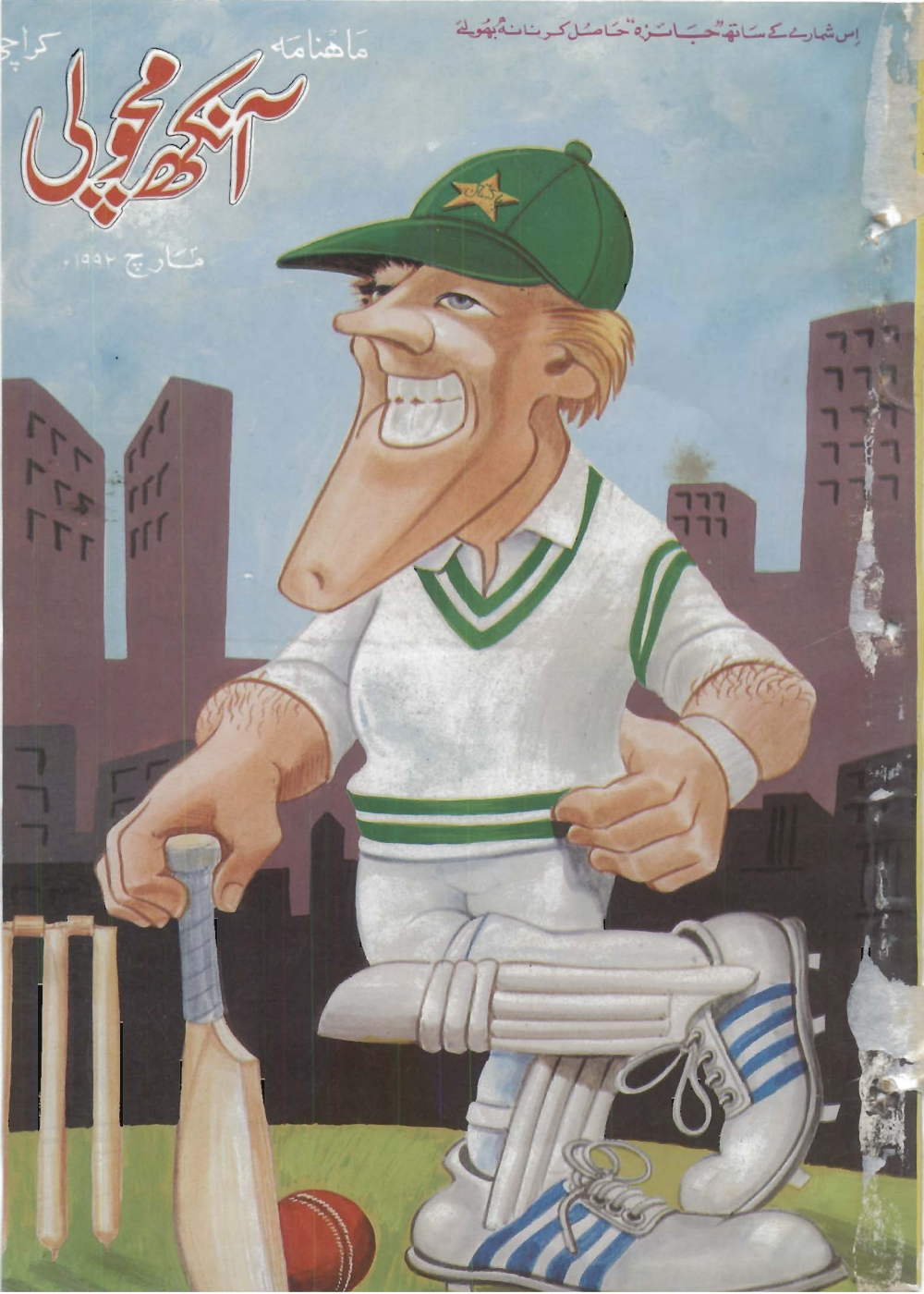

نیا
بِلوبینڈ
مارجرین
Blue Band
MARGARINE
WITH VITAMIN A&D
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

سورۃ فاتحہ

کا مسلمانوں سے سوال

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
نام اللہ کا اور کام شیطان کے

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے
تعریف اللہ کی، تقلید غیر اللہ کی

رحمان و رحیم ہے
رحمان و رحیم وہ، انعام و اکرام کی اُمید کسی اور سے

روزِ جزا کا مالک ہے
روزِ جزا کا مالک وہ، خوفِ سزا کسی اور سے

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور
عبادت اس کی، اطاعت غیروں کی

تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں
مالک و مددگار وہ، طلب و اعانت دُوسروں سے

دِکھا ہمیں سیدھا راستہ
راستہ وہ دکھائے، رہبر کوئی اور ٹھہرے

اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام فرمایا
آخر اُن لوگوں میں ہم کیوں شامل کئے جائیں جن پہ

جو معتوب نہیں ہوئے
انعام ہوا کہ انعام تو فرمانبرداروں کا حق ہے۔

جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں
اُن لوگوں میں سے کیوں نہ ہوں جن پہ غضب ہوا

کہ غضب ہی نافرمانوں کا مقدّر ہے۔

لمحۂ فکریہ

سُنا ہو تو سُنائیے

دیکھا ہو تو بتائیے

کوئی ایسا ماہنامہ

جس نے

- منفرد موضوعات پر ہر سال دو خاص نمبر شائع کئے ہوں۔
- جس کی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تخلیق سے عبارت ہو۔
- جس کے خصوصی شمارے اپنے موضوعات پر مستند کتاب کی طرح مستقل علمی حوالہ بن گئے ہوں۔
- جس نے اپنے خاص نمبر کے ساتھ انوکھے اور حسین تحائف دینے کی رسم ڈالی ہو۔
- اور جس نے مختصر ترین وقت میں لامحدود اشاعت کا ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اگر آپ ایسا ماہنامہ کہیں تلاش کر پائیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں

ماہنامہ

آنکھ مچولی

ڈی-۱۱۲، سائٹ، کراچی

ناقابلِ یقین | حیرت انگیز | لاجواب | بے مثال

آنکھ مچولی

ویڈیو میگزین

پاکستان میں پہلی بار اپنی طرز کا انوکھا، جدید اور لاجواب چلتا پھرتا ویڈیو میگزین
جسے آپ وی سی آر کے ذریعے اپنے ٹیلیویژن پر دیکھ سکیں گے

ماہنامہ آنکھ مچولی کی فخریہ پیشکش

- خوبصورت ڈرامے
- مزے دار خاکے
- لاجواب نغمے
- گیت اور ٹیبلو
- معروف شخصیات
- مشہور کردار
- مزاحیہ خبریں
- سنجیدہ گفتگو
- کام کی باتیں

اور . . . اور وہ سب کچھ جو آپ ایک خوبصورت ویڈیو کیسٹ میں دیکھنا پسند کریں

○ ..... آپ اپنے آرڈر سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔
○ ..... اپنی گلی محلے کی ویڈیو کیسٹ شاپ کو ابھی سے مطلع کر دیں۔

۲۳ مارچ ۹۲ء کو ریلیز ہو رہا ہے

آدابِ سفر

سفر وسیلہ ظفر ہے

اسے زحمت نہ بنائیے

سفر سے پہلے اپنے لیے سیٹ یا برتھ
ریزرو کروائیں اور اطمینان سے سفر کریں
یہ سہولت بیشتر گاڑیوں میں موجود ہے۔

براہ کرم پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے

محکمہ تعلقات عامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماھنامہ

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول تجمل حسین چشتی
مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد
مدیران اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل
مجلس ادارت ساجد سعید، منیر احمد راشد
اشتہارات محمد عرفان
نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی،
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی سکتی۔

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہو گا

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۹ مارچ ۱۹۹۲ء شعبان/رمضان ۱۴۱۲ھ فون ۲۹۹۱۷۸ قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط وکتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲۵۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے	ادارہ	۱۲
ماہِ رواں کی پہلی بات	ادارہ	۱۳
بہ خدمت جناب	خطوں کے جواب	۱۴
ہم روزہ کیوں رکھیں	سیّد ابوالاعلیٰ مودودی	۱۸
میٹھی مٹّی	احمد آفتاب	۲۲
سوہنی دھرتی اللہ رکھے	فرزانہ روحی	۲۷
احسان کا بدلہ	عبدالقادر	۳۲
ٹائم ٹیبل ورلڈ کپ ۹۲ء	ادارہ	۳۳
چوہے ہمارے دَور کے	رعیصاء سلیم	۳۸
ایمانداری زندہ باد	احسان الحق حقانی	۴۱
چیمپئنز ٹرافی	ضیاء الرحمٰن ضیاؔ	۴۵
کوئز کہانی	اسامہ بن سلیم	۵۰
کرشمہ	اظہر نیاز	۵۹
حیرت ناک فتح	خالد بخاری	۶۵
چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	۶۷

حسنِ ترتیب

۷۰	شاھدہ صدف	میں کیسے دل کو سمجھاؤں؟
۷۲	سلیمان احمد	تاریخی عمارتیں بیچنے والا
۷۵	بن یامین	ان سے ملئے
۸۲	عقیل عباس جعفری	ہے حقیقت کچھ
۸۸	منتخب لطائف	گلگلے
۹۳	عامر خورشید (نظم)	بارے کچھ کان کا بیاں ہو جائے
۹۹	عامر یونس	رابطہ
۱۰۵	م-الف-راشد	پوشیدہ بین بنایئے
۱۰۷	شاھنواز فاروقی	ایک عجیب روشنی
۱۱۳	آصف فرّخی	ایل ڈورا ڈو
۱۱۹	اخگر انوار اعوان	ٹراؤٹ مچھلی
۱۲۳	مختصر تحریریں	قلم قتلے
۱۳۴	تعارف	ساتھی بچپن کے
۱۳۸		امی ابو کا صفحہ
۰۰۰	انتخاب	کترنیں

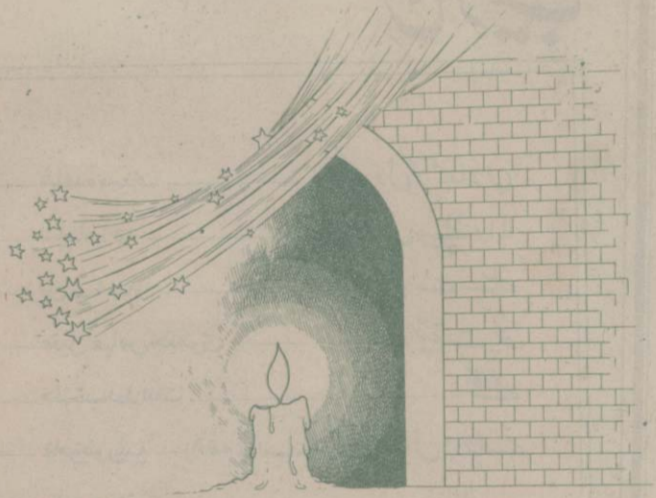

ایران کے بادشاہ نصیرالدین نے ایک روز باتوں باتوں میں اپنے درباریوں سے پوچھا، "میں زیادہ عادل ہوں یا نوشیرواں ؟" دربار کے تمام اُمرا اور وُزرا شش و پنج میں پڑ گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر انہیں نوشیرواں عادل پر ترجیح دیں تو یہ اسے خوشامد اور چاپلوسی نہ خیال کریں اور اگر اس کے برعکس جواب دیں تو شاید ناراض ہو جائیں۔ درباریوں نے کوئی جواب نہیں دیا، گردنیں جھکالیں۔

بادشاہ نے کہا، "میں خود ہی اپنی بات کا جواب دیتا ہوں۔ میں نوشیرواں سے زیادہ عادل ہوں۔" حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا اور جوش و خروش سے بادشاہ کے خیال کی تائید کرنے لگے۔ بادشاہ نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولے، "اس کی وجہ یہ ہے کہ نوشیرواں کا وزیر بزرجمہر نہایت قابل اور نکتہ شناس شخص تھا۔ نوشیرواں ہر معاملے میں اس کی رائے پر چلتے تھے۔ جب بھی وہ راستے سے بھٹکتے، ان کا وزیر بزرجمہر انہیں صحیح راستے پر لے آتا تھا۔ مگر میرے وزیر بدقسمتی سے تمہاری طرح ہیں جو ہمیشہ مجھے صحیح راستے سے ہٹانے کی بات کرتے ہیں۔ اور میں اس کے باوجود اپنے فرائض منصفانہ طریق پر انجام دیتا ہوں، میں نوشیرواں سے زیادہ عادل ہوں۔"

ماہِ رواں کی پہلی بات

پچھلے دنوں اخبار میں ایک تصویر چھپی۔ تصویر میں کسی اسکول کے بچوں کو سڑک پر مظاہرہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بچے اسکول یونیفارم پہنے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں احتجاجی بینر اور پلے کارڈز تھے۔ اور یہ مظاہرہ اسکول کو پرائیویٹ سیکٹر میں دینے کے خلاف تھا۔ یہ تصویر پہلی بار نہیں چھپی، ایسی تصویریں اخباروں میں اکثر چھپتی رہتی ہیں۔ جب بھی کسی اسکول میں کوئی بڑا تنازعہ جنم لیتا ہے بچوں کو سڑک پر لاکر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں ایسے مطالبات کی تختیاں تھما دی جاتی ہیں جن کے مفہوم اور مقصد سے وہ واقف تک نہیں ہوتے۔ بیچارے پھول سے بچے دھوپ، گرد اور ٹریفک کے شور میں گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں اور اپنے بڑوں کے حکم کی تعمیل پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسکول کے انتظامی معاملات اور تنازعات میں بچوں کو استعمال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بڑوں کے معاملات بڑوں ہی کی سطح پر طے پانے چاہیں، ان میں بچوں کو گھسیٹنا دانشمندی نہیں۔ اس طرح تو گویا بچوں کو ابتدائی عمر ہی میں ایجی ٹیشن کی تربیت دینا ہوا اور ان کے معصوم ذہنوں میں یہ نقش قائم کرنا ہوا کہ معاملات بات چیت سے طے نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے ہنگامہ آرائی اور سڑکوں کی سیاست ضروری ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بسا اوقات کسی درست اور نیک مقصد کے لئے بچوں کو استعمال کیا جاتا ہے لیکن دیکھا جائے تو اس طریقۂ کار کے دوررس نقصانات ہیں۔ بچوں میں یہ احساس پیدا ہونا کہ وہ بھی حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں اور اس طرح اپنی بات منوا سکتے ہیں، آگے چل کر اسکول کے حق میں مفید ہوتا ہے نہ اساتذہ کرام کی عزت و توقیر میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ آج کل کے بچے ماشاء اللہ نہایت ہوش مند اور سمجھدار ہیں۔ ہمارے خیال میں کسی اسکول میں ایسا کوئی موقع آئے تو وہاں کے طلبا کو بھی اس احتجاجی سیاست میں آلۂ کار بننے سے انکار کر دینا چاہئے۔ اور محکمۂ تعلیم کو بھی اس سلسلے میں اسکولوں کو خصوصی ہدایات جاری کرنی چاہئیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اخبارات بھی ایسی تصویریں نہایت اہتمام سے چھاپ دیتے ہیں اور اس کے نتائج پر غور نہیں کرتے۔ اخبارات نوٹس لیں تو اس رجحان میں بڑی حد تک کمی آسکتی ہے اور نونہالانِ وطن کے سیاسی استعمال کا یہ ناپسندیدہ طریقہ ترک ہوسکتا ہے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

محمد علی عرسانی۔ جامشورو، حیدر آباد

میں آپ سے بہت ناراض ہوں اس لئے کہ آپ نے میرے سندھی لطیفے تو شائع کر دیئے لیکن آپ نے میرا اب تک کوئی خط یا کوئی اور تحریر شائع نہیں کی۔ اچھا ایک بات بتایئے "حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ جواب ضرور دیجئے گا۔

○ ..... حق اسکواڈ کے لئے دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوا دیجئے۔

نثار احمد سومرو ہرنائی

میں نے آج تک ایسا رسالہ نہیں دیکھا۔ جس نے ہر سال دو خصوصی شمارے شائع کئے ہوں۔ اور ہر شمارے کے ساتھ تحفے دیئے ہوں۔ اگر دیکھا ہے تو یہی آنکھ مچولی دیکھا ہے۔

عالمی ادب نمبر کی بات ہی کچھ اور تھی۔

خیال محمد، مینگورہ سوات

میری آپ سے چند گزارشات ہیں آپ خطوط کے کالم میں وہ خطوط شائع کریں جو جواب طلب، وضاحت طلب یا جن میں تجاویز ہوں۔ تعریفی خطوط شائع نہ کیا کریں۔

خطوط کے جوابات واضح طریقے سے دیا کریں تاکہ بچے مطمئن ہو جائیں۔

فرزانہ اشرف بٹ۔ کوئٹہ

آنکھ مچولی کے عالمی ادب نمبر کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں نے آج تک اتنا بہترین رسالہ نہیں پڑھا۔ ایک ایک کہانی کو میں کئی بار پڑھ چکی ہوں انکل میں نے آپ کو پہلے بھی ایک خط لکھا تھا۔ لیکن آپ نے جواب نہیں دیا۔ اگر میرے اس خط کا جواب آپ نے نہیں دیا۔ تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔

سید سمیرا اظہر گردیزی اسمیتز، لاہور

عالمی ادب نمبر پڑھا بہت مزا آیا۔ تحفے کا بھی مزا آیا اگر کیلنڈر حقیقت پر مبنی ہوتا تو مزا آتا۔ اس کے علاوہ کیلنڈر کے نیچے جو جملے لکھے تھے وہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف تھا۔

حماد الرحمٰن مغل۔ بھاولنگر

عالمی ادب نمبر مجھے اور میرے تمام گھر والوں کو بے حد پسند آیا۔ میری باجی بڑوں کے رسالے پڑھتیں ہیں میں نے ان کو رسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ ان کو رسالہ اتنا پسند آیا کہ تین گھنٹے میں پڑھ ڈالا اور کہا کہ واقعی یہ رسالہ لاجواب ہے۔ مجھے بھی اس کی تمام کہانیاں بے حد پسند آئیں۔

محمد اعجاز عابد۔ کچھ سوال

میری ایک تجویز ہے وہ یہ کہ آپ ان بچوں کے ناموں کی فہرست شائع کر دیا کریں جن کی کہانیاں قابل اشاعت ہوتی ہیں۔ تاکہ بچوں کو تسلی ہو جائے۔ اور اگر ان بچوں کے نام جن کی کہانیاں کسی وجہ سے مسترد ہو جائیں بھی شائع کر دیا کریں تو مہربانی ہوگی۔

ہما جبیں۔ مظفر گڑھ

میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ آنکھ مچولی لیا۔ واہ واہ ! کیا آنکھ مچولی ہے بھیا نے میرا رسالہ الماری میں رکھ کے تالا لگا دیا کہتے ہیں جب تک سالانہ امتحان نہیں ہو جاتے رسالہ نہیں ملے گا اب بتائیے ایسے رسالے کا کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر واقعی آپ کا رسالہ اچھا ہے تو مجھے کوئی حل بتائیں نا پلیز اچھے بہت اچھے زیادہ اچھے ایڈیٹر انکل۔

صولت رعنا چوہدری، راولپنڈی

انکل لگتا ہے آپ کو ہم سے دشمنی ہے جس وجہ سے آپ آنکھ مچولی کا سرورق میرے بھتیجوں کی پسند کا بناتے ہیں اگر وہ ایک بار رسالہ دیکھ لیں تو پھر شامت آجاتی ہے ہر کوئی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس دھینگا مشتی میں اکثر رسالے کے پرخچے اڑ جاتے ہیں میری عادت ہے کہ میں اپنا کوئی رسالہ یا کتاب خراب نہیں ہونے دیتی پلیز توجہ دیں۔

غزالہ نسیم، کراچی

مجھے یہ بتائیے کہ آپ جو حیرت ناک چیزیں شائع کرتے ہیں وہ صحیح ہوتی ہیں یا نہیں۔ مجھے آپ کی عجیب خبریں پڑھ کر یقین نہیں آتا۔

○ ..... ہم چھاپتے بھی اس لئے ہیں کہ خبریں ناقابلِ یقین ہوتی ہیں۔

عدیل الرحمان، گوجرانوالہ

مجھے رسالہ اتنی دیر میں کیوں ملتا ہے میرے دوست کو رسالہ ہمیشہ پہلے مل جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

□ ..... پرچے کے لئے ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ مقرر ہے۔

محمد سعید گلاب، کورنگی کراچی

میں نے آنکھ مچولی کے تمام گزشتہ شماروں کو بڑی محنت سے گتے والی جلد چڑھا کر محفوظ کیا ہوا ہے اب ۱۹۹۲ء جنوری سے آپ کا رسالہ خریدار بننا تھا اس لئے پھاڑنا ہی پڑا پلیز آپ کوپن والے صفحے کے پیچھے کوئی کہانی نظم یا مضمون بالکل نہ چھاپا کریں۔

احسن نقوی، نارتھ کراچی۔

تجویز ہے کہ جولائی میں آنے والا خاص نمبر "کمپیوٹر نمبر" ہو تاکہ ہمارے قارئین کو اس تیز رفتار دور میں کمپیوٹر کی افادیت کا پتا چلے یہ بتایئے کہ آپ آنکھ مچولی کو شائع کرنے میں کمپیوٹر سے کام لیتے ہیں اگر لیتے ہیں تو اچھی بات ہے۔

فرحین گلفام، گلشن اقبال کراچی

میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ مقابلہ خطاطی میں اللہ تعالیٰ کے ۱۹۹ اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی بھی ایک نام انتہائی دلکش انداز سے لکھنے کا مقابلہ کرایئے۔ اگر آپ یہ مقابلہ کرائیں گے تو میں بھی اس مقابلے میں شرکت کرنے کی کوشش کروں گی۔

سید ضوریز احمد واسطی، لاہور

اگر آپ میری نظم شائع نہیں کریں گے تو دوسرے لفظوں میں آپ ایک شاعر کو اور ایک ادیب کو (کہانی بھی لکھ رہا ہوں) پیدا ہونے سے روک رہے ہیں۔ یہ نظم کافی طویل تھی میں نے اس کی کاٹ چھانٹ کی ہے اب مزید کرنے کی صورت میں یہ اپنا حسن کھو دے گی، براہِ مہربانی اسے قبول کر لیجئے اور رسالے کی زینت بنایئے۔

شاہ رخ ہمایوں، پنڈی بھٹیاں

ایک بات بتایئے۔ آپ نے بہت سے خاص نمبر نکالے۔ لیکن لطیفہ نمبر نکالنے کا کب ارادہ ہے۔ جواب ضرور دیجئے۔

عطیہ نواز، شیخوپورہ

میں نے جب سے آنکھ مچولی پڑھنا شروع کیا ہے۔ بہت دل چاہتا ہے کہ میں آنکھ مچولی کے لئے کچھ لکھوں سو مجھے موقع مل ہی گیا آپ میری کہانی ضرور پڑھئے بے شک اچھی نہ لگے تو مت شائع کیجئے۔

لالہ برکت علی چنہ، نوے ای گورنمنٹ اسکول، نصیر آباد

جن بچوں کو بھی ڈاک ٹکٹ جمع کرنے یا باہر ملکوں سے معلوماتی کتب چاہیں وہ مجھ سے رابطہ کریں۔

نوید انجم، ایمن آباد

میری ایک تجویز ہے کہ آپ علمی آزمائش کا سلسلہ بھی شروع کیجئے پچھلے شمارے کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔

ثمینہ برڑو، ٹھٹھہ

ایک ساتھی کا خط پڑھا کہ آنکھ مچولی پر سندھ اور کراچی کے ساتھیوں کی اجارہ داری ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کا بیان صحیح ہے یا غلط۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ انہوں سندھ اور کراچی کا نام الگ الگ کیوں لیا کیا سندھ اور کراچی دو علیحدہ چیزیں ہیں؟

جمشید خان، محمدی کالونی، کراچی

آنکھ مچولی بہت اچھا لگا مگر انعامی مقابلے نہیں ہیں۔

رانا جاوید احمد، شاہ پور چاکر

انکل! آنکھ مچولی پہلی مرتبہ پڑھا بہت پسند آیا۔ آپ کی محفل میں پہلی بار آرہا ہوں۔ پلیز دل مت توڑیئے گا۔

سیدہ نجمہ نورین، پشاور

میں آپ کو یہ دوسرا لطیفہ بھیج رہی ہوں پہلا تو آپ نے شائع نہیں کیا لیکن اب یہ لطیفہ ضرور شائع کر دیجئے ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔

آنکھ مچولی کو درج ذیل ساتھیوں کے بھی خطوط ملے ہیں۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے

(۱) عمران باری، غلام باری، جیکب آباد۔ (۲) محمد ارتضیٰ خان، دوحہ قطر۔ (۳) محمد ارشد ہمدم، نرتوپہ۔ (۴) سجاد قریشی، گوٹھ پٹار۔ (۵) انیس احمد انصاری، خیرپور۔ (۶) حماد الرحمٰن مغل، بہاول نگر۔ (۷) سید محمد شاہ کھوکھر، حیدر آباد۔ (۸) محمد بلال بخاری، کوٹ ادو۔ (۹) خواجہ ایاز، ضلع گجرات۔ (۱۰) محبوب عبدالرزاق، کراچی۔ (۱۱) رفاقت اللہ یوسف زئی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ (۱۲) عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ۔ (۱۳) اظہر رضا اجنبی کراچی۔ (۱۴) صداقت حیات، ضلع چکوال۔ (۱۵) اختر علی سیماب، ملتان۔ (۱۷) محمد عثمان، کراچی۔ (۱۸) محمد رفیق دانش، حیدر آباد۔ (۱۹) محمد معاویہ، ٹیکسلا۔ (۲۰) ثقلین حسن شہریار، جھنگ صدر۔ (۲۱) محمد حسین، راولپنڈی۔ (۲۲) محمد خباب امین، لاہور۔ (۲۳) ذوالفقار احمد پرنس، لاہور۔ (۲۴) محمد نسیم رفیع، سکھر۔ (۲۵) سید احسن علی، کراچی۔ (۲۶) محمد سلیم ملک، خیرپور۔ (۲۷) ارم فاطمہ، کوئٹہ۔ (۲۸) رئیس احمد مغل، پشاور۔ (۲۹) ابو خضر، کراچی۔ (۳۰) فریحہ اکرم، کوٹ ادو۔ (۳۱) محمد شریف قادری، کراچی (۳۲) محمد اختر خواجہ، ملتان۔ (۳۳) شاہد محمود آصف، کراچی۔ (۳۴) صبا اختر، کراچی۔ (۳۵) تسنیم ذہرہ خان۔ (۳۶) محمد اسد فیاض، چکوال۔ (۳۷) معین الدین، کراچی۔ (۳۸) انیلا ظفر، لاہور۔ (۳۹) فیصل وقار، کراچی۔ (۴۰) حنا قمر صدیقی، حیدر آباد۔ (۴۱) نعمان طارق خان، ضلع اٹک۔ (۴۲) محمد محبوب علی، (۴۳) ن۔ م۔ ترخیوال، مینگورہ سوات۔ (۴۴) اشعر فواد، ملتان۔ (۴۵) ابو معاویہ، میلسی۔ (۴۶) عائشہ لطیف، اوکاڑہ۔ (۴۷) پیر محمد پیرل، مکران۔ (۴۸) ممتاز حبیب صابر، مردان۔ (۴۹) جاوید علی تالپور۔

سانحہ

روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر انچیف جناب میر خلیل الرحمٰن کی وفات اردو صحافت کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ میر صاحب نے مسلسل محنت اور جدوجہد سے "جنگ" کو اردو دنیا کا سب سے بڑا اخبار بنا دیا تھا۔ آپ کو بچوں سے بھی محبت تھی۔ اور آپ نے "جنگ" میں "نونہال لیگ" کے عنوان سے بچوں کا صفحہ شروع کیا۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے ایک رسالہ "بھائی جان" بھی نکالا جو بچوں میں بہت مقبول ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت نصیب کرے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ہم روزہ کیوں رکھیں؟

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

روزہ، نماز کے بعد دوسری عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کی ہے۔ روزے سے مراد یہ ہے کہ صبح سے شام تک آدمی کھانے پینے سے پرہیز کرے۔

نماز کی طرح یہ عبادت بھی ابتدا سے تمام پیغمبروں کی شریعت میں فرض رہی ہے۔ پچھلی جتنی امتیں گزری ہیں سب اسی طرح روزے رکھتی تھیں جس طرح اُمتِ محمدی رکھتی ہے۔ آج بھی اکثر مذاہب میں روزہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے۔ اگرچہ لوگوں نے بہت سی باتیں ملا کر اس کی شکل بگاڑ دی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا۔" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی شریعتیں آئی ہیں وہ کبھی روزے کی عبادت سے خالی نہیں رہی ہیں۔

غور کیجئے کہ آخر روزے میں کیا بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کی ہر زمانے میں فرض کیا ہے؟

اسلام کا اصل مقصد انسان کی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت بنا دینا ہے۔ انسان عبد یعنی بندہ پیدا ہوا ہے اور عبدیت یعنی بندگی اس کی عین فطرت ہے۔ اس لئے عبادت یعنی خیال و عمل میں اللہ کی بندگی کرنے سے کبھی ایک لمحہ کے لئے ہی اس کو آزاد نہ ہونا چاہئے۔ اسے اپنی زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ اور ہر وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کس چیز میں ہے اور اس کا غضب اور ناراضی کس چیز میں۔ پھر جس طرف اللہ کی رضا ہو اُدھر جانا چاہئے اور جس طرف اس کا غضب اور اس کی ناراضی ہو اس سے یوں بچنا چاہئے جیسے آگ کے انگارے سے کوئی بچتا ہے۔ جو طریقہ اللہ نے پسند کیا ہو اس پر چلنا

چاہئے اور جس طریقے کو اس نے پسند نہ کیا ہو اس سے بھاگنا چاہئے۔ جب انسان کی ساری زندگی اس رنگ میں رنگ جائے تب سمجھو کہ اس نے مالک کی بندگی کا حق ادا کر دیا۔

نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے نام سے عبادتیں ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کا اصل مقصد اس بڑی عبادت کے لئے ہم کو تیار کرنا ہے۔ ان کو فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تم نے دن میں پانچ وقت رکوع اور سجدہ کر لیا اور رمضان میں تیس دن تک صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کر لی اور مالدار ہونے کی صورت میں سالانہ زکوٰۃ اور عمر میں ایک مرتبہ حج ادا کر دیا تو اللہ کا جو حق تم پر تھا وہ ادا ہو گیا اور اس کے بعد تم اس کی بندگی سے آزاد ہو گئے کہ جو چاہو کرتے پھرو۔ بلکہ دراصل ان عبادتوں کو فرض کرنے کی غرض یہی ہے کہ ان کے ذریعے سے آدمی کی تربیت کی جائے اور اس کو اس قابل بنایا جائے کہ اس کی پوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے۔ آیئے اب اس مقصد کو سامنے رکھ کر ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح آدمی کو اس بڑی عبادت کے لئے تیار کرتا ہے۔

روزے کے سوا دوسری جتنی عبادتیں ہیں وہ کسی نہ کسی ظاہری حرکت سے ادا کی جاتی ہیں، مثلاً نماز میں آدمی اٹھتا اور بیٹھتا ہے اور رکوع اور سجدہ کرتا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حج میں ایک لمبا سفر کر کے جاتا ہے اور پھر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زکوٰۃ بھی کم از کم ایک شخص دیتا اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ ان سب عبادتوں کا حال چھپ نہیں سکتا۔ اگر آپ ادا کرتے ہیں تب بھی دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے اگر ادا نہیں کرتے تب بھی لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف روزہ ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ نہ کھائے پیئے مگر چھپ کر پانی پی جائے یا کچھ چوری چھپے کھالے تو خدا کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکتی ساری دنیا یہی سمجھتی رہے گی کہ وہ روزے سے ہے اور حقیقت میں روزے سے نہ ہو گا۔

روزے کی اس حیثیت کو سامنے رکھو پھر غور کرو کہ جو شخص حقیقت میں روزے رکھتا ہے اور اس میں چوری چھپے کچھ نہیں کھاتا پیتا، سخت گرمی کی حالت میں بھی جبکہ پیاس سے حلق چٹخا جاتا ہو، پانی کا ایک قطرہ حلق سے نہیں اتارتا، سخت بھوک کی حالت میں بھی جبکہ آنکھوں میں دم آرہا ہو کوئی چیز کھانے کا ارادہ تک نہیں کرتا، اسے اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے پر کتنا ایمان ہے۔ کس قدر زبردست یقین کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت چاہے ساری دنیا سے چھپ جائے مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتی۔ کیسا خوفِ خدا اس کے دل میں ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر صرف اللہ کے خوف سے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے روزے کو توڑنے والا ہو۔ کس قدر مضبوط اعتقاد ہے اس کو

آخرت کی جزا اور سزا پر کہ مہینہ بھر میں وہ کم از کم تین سو ساٹھ گھنٹے کے روزے رکھتا ہے اور اس دوران میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں آخرت کے متعلق شک کا شائبہ تک نہیں آتا۔ اگر اسے اس بات میں ذرا سا بھی شک ہوتا کہ آخرت ہوگی یا نہیں ہوگی اور اس میں عذاب و ثواب ہوگا یا نہ ہوگا تو وہ کبھی اپنا روزہ پورا نہیں کر سکتا۔ شک آنے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کے ارادے پر قائم رہ جائے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ہر سال کامل ایک مہینہ تک مسلمان کے ایمان کو مسلسل آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش میں جتنا جتنا آدمی پورا اترتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

یہ گویا آزمائش کی آزمائش ہے اور ٹریننگ کی ٹریننگ۔

اور جب اس آزمائش پر آپ پورے اترتے ہیں تو آپ کے اندر اس بات کی مزید قابلیت پیدا ہونے لگتی ہے کہ اللہ سے ڈر کر دوسرے گناہوں سے بھی پرہیز کریں۔ اللہ کو عالم الغیب جان کر چوری چھپے بھی اس کے قانون کو توڑنے سے بچیں اور ہر موقع پر قیامت کا وہ دن آپ کو یاد آجایا کرے، جب سب کچھ کھل جائے گا اور بغیر رو رعایت کے بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا بدلہ ملے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ

"اے ایمان والو! تمہارے اوپر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کئے گئے تھے شاید کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔"

روزے کی ایک دوسری خصوصیت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ایک لمبی مدت تک شریعت کے احکام کی لگاتار اطاعت کراتا ہے۔ نماز کی مدت ایک وقت میں چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت سال بھر میں صرف ایک بار آتا ہے۔ حج میں البتہ لمبی مدت صرف ہوتی ہے۔ مگر اس کا موقع عمر بھر میں ایک دفعہ آتا ہے۔ اور وہ بھی سب کے لئے نہیں۔ ان سب کے برخلاف روزہ ہر سال پورے ایک مہینے تک شب و روز شریعتِ محمدی کے اتباع کی مشق کراتا ہے۔ صبح سحری کے لئے اٹھو، ٹھیک فلاں وقت پر کھانا پینا سب بند کر دو، دن بھر فلاں فلاں کام کر سکتے ہو اور فلاں فلاں کام نہیں کر سکتے، شام کو ٹھیک فلاں وقت پر افطار کرو، پھر کھانا کھا کر آرام لو، پھر تراویح کے لئے دوڑو۔ اسی طرح ہر سال کامل مہینہ بھر صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مسلمان کو مسلسل فوجی سپاہیوں کی طرح پورے قاعدے اور ضابطے میں باندھ کر رکھا جاتا ہے اور پھر گیارہ مہینہ کے لئے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جو تربیت ایک مہینہ میں اس نے حاصل کی ہے اس کے اثرات ظاہر ہوں اور جو کمی پائی جائے وہ پھر دوسرے سال کی ٹریننگ میں پوری کی جائے۔

دُنیا کا سب سے بڑا مُجسّمہ

ولگوگراڈ

(روس) کے قریب مامایو کی پہاڑیوں
پر تعمیر کیا گیا یہ مجسّمہ دُنیا کا سَب سے
بڑا مجسّمہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے ۱۹۴۲ء میں
اسٹالن گراڈ کی جنگ میں کامیابی کے بعد
فتح کی علامت کے طور سے تعمیر کیا گیا،
(حوالہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ)

٥

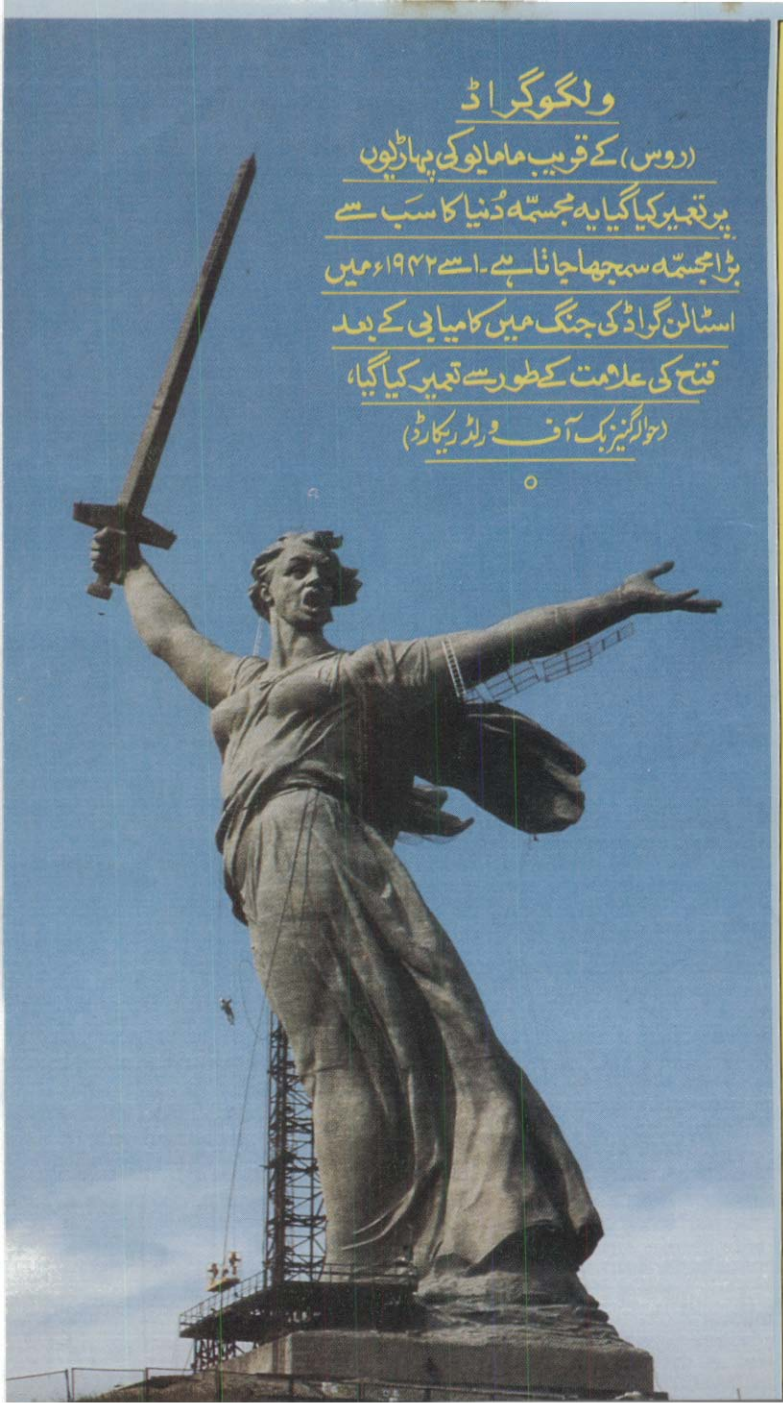

میٹھی مٹی

آفتاب احمد

طوفانی ہوا پاگلوں کی طرح شور مچاتی، مری کی سڑکوں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔ وہاں بہت سردی تھی۔ سخت ٹھنڈ کہ۔ فضا میں برف کے گالے اڑ رہے تھے اور ہر چیز جیسے سفید رنگ کی ایک دبیز چادر میں چھپ گئی تھی۔ گاڑیاں، کھمبے، بجلی کے تار، لیٹر بکس، چھوٹے چھوٹے پودے ہر طرف ایک بے حسی کا تاثر جما ہوا تھا۔

اسی منظر کا حصہ چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت بھی تھی۔ اسکول کے دروازہ کے سامنے، نیم کے درخت سے ٹیک لگائے ہوئے اور اس قدر سکون سے کھڑی تھی گویا برف کا کوئی مجسمہ..... اس کی نظریں اسکول کے گیٹ پر جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں کی حرکت کے علاوہ اس کے بدن میں زندگی کے کوئی

آثار نہیں تھے۔ اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

فضا میں پھیلے سکوت کو گھنٹی کی آواز نے بکھیر دیا اور سینکڑوں بچے اچھلتے، کودتے، گاتے ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے، پلک جھپکتے میں باہر نکل آئے۔ عورت نے تیزی سے اپنی نظریں آس پاس دوڑائیں ان میں اس کا بیٹا نہیں تھا۔ سڑک پر بچوں کا رش کم ہونے لگا۔ فضا آہستہ آہستہ پرسکون ہوتی گئی۔ پھر منظر ویسا ہی ہوگیا۔ پراسرار..... منجمد..... بے حس۔

عورت کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں..... وہ لڑکھڑاتے ہوئے اسکول کے پھاٹک کی طرف بڑھی اور اسے زور زور سے ہلانے لگی۔

"اے..... پاگل ہوگئی ہو کیا؟" چوکیدار نے غصّے سے دروازے پر سے جھانکا۔

"میرا بیٹا کہاں ہے؟" عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کون بیٹا.....؟ مجھے کیا پتا تمہارا بیٹا کون ہے؟" چوکیدار بولا۔

"خلد..... خالد محمود۔"

"کون سی کلاس میں.....؟" عورت سوچ میں پڑ گئی۔

"آج..... اس کی..... آٹھویں سالگرہ ہے۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔ چوکیدار گھبرا گیا۔

"ارے..... دیکھو..... رونے کی کیا بات ہے۔ میں نے پوچھا تھا وہ کون سی کلاس میں ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔" عورت نے زور زور سے سر ہلایا۔ "آج وہ آٹھ سال کا ہوگیا ہے۔"

"تمہیں نہیں پتا۔" چوکیدار حیرت سے بولا۔ "تم کون ہو اس کی..... ماں؟" عورت نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے آنسوؤں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"مم...میں..... اس کی کوئی..... نہیں..... ہوں۔ تم ایک مہربانی کرو۔ یہ۔ ٹافیاں اسے دے دینا۔" عورت نے ایک پیکٹ چوکیدار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ اسے بہت پسند ہیں۔ بہت پسند۔" وہ روتی ہوئی پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دور نکل گئی۔ چوکیدار اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

اگلے دن وہ ٹافیاں تیسری جماعت کے خالد محمود کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ یہ اس کی پسندیدہ ٹافیاں تھیں اور اسے کافی عرصہ کے بعد میسّر آئی تھیں..... چوکیدار نے بطور خاص نام پوچھ کر اسے پیکٹ دیا تھا، مگر یہ نہیں بتایا کہ ٹافیاں کون لایا؟ اسے اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ ٹافیاں مل

گئیں اب وہ بہت خوش تھا۔

اس نے خوشی خوشی اپنی قمیص پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر اپنے ہم جماعتوں میں ٹافیاں تقسیم کرنے لگا۔ اس نے اپنے اچھے دوستوں کو دو دو ٹافیاں دیں اور ٹیچر کے سامنے پیکٹ کر دیا۔ انہوں نے اس میں سے دو ٹافیاں لے لیں۔

وہ دن خالد کی زندگی کا بہترین دن تھا۔ ہم جماعت اس کی تعریف کر رہے تھے اور للچائی ہوئی نظروں سے اس کی قمیص کی طرف دیکھ رہے تھے جو بہت ساری ٹافیوں کی وجہ سے پھولی ہوئی تھی۔ اس نے سب سے اکڑ کر بات کی اور چھٹی کے بعد خوشی سے اچھلتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ برف باری آج بھی ہو رہی تھی مگر نجانے کیوں اسے سب اچھا لگ رہا تھا۔ روز ایسا نہیں ہوتا تھا۔ روزانہ تو وہ سہما ہوا، خوفزدہ اپنے گھر کی طرف جاتا تھا اور بھیگی ہوئی بلی کی طرح دبک کر ایک کونے میں گھس جاتا تھا۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ ایک عورت تیوریاں چڑھائے، آنکھوں میں نفرت لئے اس کے باپ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پھر اس کا باپ سوتیلی ماں کی جھوٹی سچی باتیں سن کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہے۔ اس نے ڈنڈا فضا میں بلند کیا اور .....

خالد کو خوف سے جھرجھری آگئی وہ دہشت زدہ ہو کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ پھولی ہوئی جیب کا وزن اچانک اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اگر اس کے سوتیلے بھائی بہنوں نے اتنی بہت سی ٹافیاں دیکھ لیں ..... تو وہ یقیناً ابو کو بتائیں گے ..... پھر ڈنڈا ..... اس نے غمگین آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک کے کنارے برف کا اونچا ڈھیر جما ہوا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ خالد جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے ساری ٹافیاں سڑک کے کنارے برف میں دفن کر دیں اب وہ محفوظ تھیں۔ اس نے سوچا۔ نشانی لگانے کے لئے اس نے ڈھیر پر چھوٹی سی لکڑی گاڑ دی۔

اس رات خالد کو بہت میٹھی نیند آئی۔ ٹافیاں اس کے خوابوں میں چکراتی رہیں۔ چھوٹی، بڑی، سادہ، رنگین کاغذ والی، کھٹی میٹھی ٹافیاں ..... اس نے دیکھا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ اس کی ہر شاخ پر ٹافیاں ہیں وہ سب سے اوپر کی شاخ پر دیکھتا ہے وہاں اس کی سوتیلی ماں لٹکی ہوئی ہے۔ سر کے بل، خالد ایک موٹی سی شاخ توڑتا ہے اور نیچے سے نشانہ لے کر اوپر پھینکتا ہے۔ سوتیلی ماں نیچے گر جاتی ہے۔ اس کے موٹے سر پر ایک گول مٹول ٹافی ابھر آئی ہے۔

اگلے دن اس نے اسکول کی تیاری کی اور چپکے سے گھر سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ٹافیاں نکالنے کے لئے اڑ کر پہنچ جائے۔ اس نے دور سے دیکھا۔ سڑک پر برف کا ڈھیر نہیں تھا۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

"نہیں شاید مجھے دور سے غلط نظر آرہا ہے۔" اس نے سوچا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ سڑک پر برف کا ڈھیر موجود نہیں تھا۔ دھوپ نے برف کو پگھلا دیا تھا اور اب بھیگی ہوئی زمین پر چند کاغذ اور نشانی کی لکڑی پڑی ہوئی تھی۔

خالد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور اداس نظروں سے زمین کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بے اختیار اپنا ننھا سا ہاتھ آگے بڑھا کر مٹی اٹھالی اور اسے چاٹنے لگا۔

مٹی بہت میٹھی تھی.....

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی
سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبرشپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰/ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے
رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی — ڈی-۱۱۲، سائیٹ کراچی

سوہنی دھرتی اللہ رکھے

فرزانہ روحی

ایک، دو، تین، ساڑھے تین..... اور یہ اٹھنّی ملا کر پورے چار روپے۔ اس نے مسرت سے ٹمٹماتے چہرے کے ساتھ روپے گنے ۔ دو دن بعد پورے ہو جائیں گے چھ روپے۔ پھر میں بانسری خرید لوں گا۔

پیسے اسکول بیگ میں رکھ کر وہ بستر پر لیٹ گیا اور تصور میں دیکھنے لگا کہ اس نے بانسری لبوں سے لگا رکھی ہے۔ اور فضا میں مدھر تانیں بکھر رہی ہیں۔

یہ اس کا بہت پرانا خواب تھا۔ یہ خواب اس نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب اس نے اسکول واپسی پر بانسری والے سے بانسری کی سریلی آواز سنی تھی۔

بانسری والا دبلا پتلا لمبے قد کا بوڑھا آدمی تھا اور صدر کی مصروف شاہراہ سے ذرا ہٹ کر پول سے ٹیک

لگائے بانسری پر کوئی خوبصورت دھن بکھیر تا رہتا تھا جسے سن کر آتے جاتے لوگوں کے قدم چند لمحے کے لئے تھم جاتے تھے۔

ثاقب نے جب پہلی بار سنا تھا تو اس کے سُر دل میں اترتے اور رگوں میں دوڑتے محسوس ہوتے تھے اس کی آرزو تھی کہ وہ بھی بالکل اسی طرح بانسری بجائے اور ایک دن گھر، محلے اور اسکول میں سریلے سروں کا مظاہرہ کرکے سب سے داد وصول کرے۔ وہ خود کو اکثر اس روپ میں دیکھا کرتا۔

ثاقب کو بانسری کی مدھر سریلی دھن کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی، جو اس ہنگاموں بھری دنیا سے الگ ہوتی، بالکل الگ۔ بانسری والا اپنے فن میں طاق تھا جب وہ خاص موقعوں پر خاص دنوں کی مناسبت سے اس فٹ پاتھ پر کھڑا بانسری پر کسی خوبصورت نغمے کی دھن چھیڑتا تو ارد گرد لوگوں کا میلہ سا لگ جاتا۔

۲۳ مارچ کی ایک چمکتی دوپہر، جب ثاقب اپنے اسکول کے پروگرام میں شرکت کرکے واپس آرہا تھا تو دور ہی سے "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد" کی خوبصورت دھن ہوا کے لہروں پر تیرتی اس کی سماعت سے ٹکرائی، قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، لوگوں کے ہجوم کے درمیان وہ جھوم جھوم کے بانسری بجا رہا تھا۔ دفعتاً ایک گاڑی قریب آکر رکی اور چار پانچ غیر ملکی مرد اور خواتین گاڑی سے اترے، لوگوں کا ہجوم اب بانسری والے کے بجائے غیر ملکیوں کی طرف متوجہ تھا، انگریز عورت چبوترے پر بیٹھ گئی۔

"اے مین! تم کیا گاتا ہائے؟" تھوڑی دیر بعد اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

"سوہنی دھرتی میم صاحب۔" بانسری والے نے جواب دیا۔

"وہاٹ!؟" اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا، بانسری والے نے اسے سوہنی دھرتی کا مطلب سمجھانے کے لئے نیچے مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ انگریز عورت کو ہجوم میں سے ایک لڑکے نے انگریزی میں گیت کے بول سمجھائے۔

بانسری والے نے دوبارہ دھن چھیڑ دی اور سارے غیر ملکی بانسری کی لے پر جھومنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا،

"مین! تُم ہمارا ساٹ لنڈن چھلو ہم تُمھارا پروگرام بنائے گا۔ تُمھارے کو اُدھر بوت پیسہ ملے گا"۔

بانسری والے نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف انکار میں سر ہلا دیا۔

اب وہ بانسری پر ایک اور نئی دھن چھیڑ چکا تھا۔

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن،

"اب تمہارا فلوٹ (بانسری) کیا بولتا؟" میم نے دلچسپی سے سوال کیا۔

"میم صاحب، یہ نہیں بولتا۔" اس نے بانسری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتلایا، "بجانے والے کا دل بولتا ہے۔"

"او تم بوٹ بڑا آدمی ہائے تم اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کس کا واسطے فلوٹ بجاتا۔؟" انگریز عورت بولی۔

"سب کے واسطے۔" بانسری والے نے کہا۔

"تم کو اس سے کیا ملتا ہائے؟"

"سکون ملتا ہے صاحب۔"

"سکون؟! اِدر تو سب ڈسٹرب ہائے۔ اور پرابلم ہائے، (ہے) سب جاب لیس (بے روزگار) ہائے۔ اینڈ گریب کو تو کچھ نہیں ملتا۔" ایک غیر ملکی بولا۔ بانسری والے نے اسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو:

"ہاں گورا صاحب، تم ٹھیک بولتا ہے ادھر بہت پرابلم ہے۔ ہم غریب لوگ کچھ نہیں کر سکتا۔ پر خواب تو دیکھ سکتا ہے نا۔" اس کے چہرے پر اداسی تھی لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔

وہ سب اسے بغور دیکھتے رہے پھر وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ ثاقب سمیت سب لوگ انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

.....○○.....

"ہاتھ میں مائک تھامے، خوبصورت سوٹ میں ملبوس نوجوان شخص نے بانسری والے کو با آواز بلند سلام کیا۔ دوسرے آدمی نے اپنے کاندھے پر رکھے مووی کیمرے کا رخ بانسری والے کی طرف کر دیا۔

وہ لوگ غالباً ٹیلی ویژن کی طرف سے آئے تھے اور بانسری والے پر کوئی پروگرام بنا رہے تھے۔

اس نوجوان کے کچھ پوچھنے پر بانسری والے نے اپنے ہونٹ بانسری سے ہٹائے اور بولا،

"بابو جی! میں بانسری بیچتا ہوں، سُر نہیں بیچتا۔"

ثاقب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا بانسری والا تو واقعی فنکار تھا۔

"انکل! کیا یہ پروگرام ٹی وی پر آئے گا۔" ثاقب نے معصومیت سے اس آدمی سے پوچھا جو ہاتھ میں کاغذ لئے دوسرے دونوں افراد کو وقفے وقفے سے کچھ ہدایات دیتا جا رہا تھا۔

"جی ہاں، آج رات پروگرام "عوامی فنکار" میں یہ دکھایا جائیگا۔"

اب بانسری والے کا باقاعدہ انٹرویو ریکارڈ ہونا شروع ہوا۔ انٹرویو لینے والے نوجوان نے کیمرے کی طرف رخ کر کے کہا..... "معزز ناظرین! وطن عزیز میں فنکاروں کی ایک قسم تو وہ ہے جس سے آپ ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے ذریعے واقف ہیں۔ آپ انہیں جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی۔ لیکن شاید آپ ان فنکاروں سے اچھی طرح متعارف نہیں ہیں جو ہمارے ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں کی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے گیتوں اور سُروں سے لاکھوں انسانوں کے لئے خوشی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم ان کی خدمات کی صحیح طرح قدر نہیں کرتے۔

"آج ہم آپ کی ملاقات ایک ایسے ہی فنکار سے کراتے ہیں۔ یہ ایک بانسری نواز ہیں، جو برسوں سے صدر کے علاقے میں بانسری بجاتے ہیں اور بانسری بیچتے ہیں یہ اپنے فن کا معاوضہ نہیں لیتے جو بانسری بیچتے ہیں اس کے دام لیتے ہیں۔ تو آیئے ان سے گفتگو کرتے ہیں۔"

پروگرام کا میزبان ایک لمحے کے لئے رکا۔ ثاقب بہت غور سے سن رہا تھا۔ "آپ یہاں کب سے بانسری بجا رہے ہیں؟"

"پندرہ سولہ سال ہوگئے!" بانسری والے نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت لمبا عرصہ ہے۔ آپ تھکے نہیں؟"

"سکون بانٹنے سے بھی کوئی تھکتا ہے صاحب؟"

"بہت خوب! آمدنی تو اچھی ہو جاتی ہوگی؟"

"بس گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"لیکن آپ کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے"؟

"کام؟" بانسری والا لرز گیا "کس کے لئے کام کروں جی!"

"کیوں؟ آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟" میزبان نے پوچھا۔

"تھے جی۔ مگر اب نہیں ہیں"۔ بانسری والے نے ایسے کہا جیسے اس کے مختصر جواب کے پیچھے اس کی زندگی کا بہت گہرا راز پوشیدہ ہو۔

"اپنی بات کی ذرا وضاحت کیجئے نا؟"

"صاحب میری بیوی بھی تھی اور میرے تین جگر کے ٹکڑے بھی تھے۔ لیکن اب ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ سب کو ظالموں نے مار ڈالا۔"

"کس نے مارا انہیں"؟ میزبان نے گھبرا کر پوچھا۔

"آج ہی کی طرح ۲۳ مارچ کا دن تھا۔ ڈھاکہ میں ملٹری آپریشن ہوا اور اس کی خبر جیسے ہی پھیلی۔ مکتی باہنی کے ظالموں نے میرا گھر لوٹ لیا اور میرے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ میرے شہر سنتاہار میں ہزاروں گھروں کے ساتھ یہی ہوا۔ صاحب چھوڑیں اس کہانی کو۔ اب تو آنسو بھی خشک ہوگئے ہیں۔"

بانسری والے کے اس جملے کے ساتھ ہی میزبان نے کیمرے کی طرف دیکھ کر ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور ثاقب نے دیکھا..... ٹیلی ویژن کی گاڑی جانے کے بعد بانسری والے نے ایک بار پھر دھن چھیڑ دی ہے،

"سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے۔"

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

احسان کا بدلہ

عبدالقادر

اک خوش نما تھا جنگل، ہر سو گلوں کا سایا
تھیں گنگناتی ندیاں، ہر شے پہ حسن چھایا

اک نہر کے کنارے جا پہنچی ایک چیونٹی
اک لہر ایسی آئی جس نے اسے بہایا

یوں ڈوبتے جو دیکھا، اک فاختہ نے اس کو
پیپل کا ایک پتا جلدی سے توڑ لایا

منہ میں اسے دبا کر چیونٹی کے پاس پہنچی
اس کے قریب پتا، منقار سے گرایا

پتے پہ جب وہ پہنچی، باہر اسے نکالا
چیونٹی کو فاختہ نے یوں موت سے بچایا

چیونٹی نے ایک دن پھر دیکھا عجیب منظر
جنگل میں اک شکاری، بندوق لے کے آیا

بیٹھی تھی اک شجر پر، وہ فاختہ مزے سے
اس کو خبر نہیں تھی، پیچھے ہے کون آیا

بندوق کو اٹھا کر، باندھا جونہی نشانہ
چیونٹی کو فاختہ کا احسان یاد آیا

آگے پہنچ کے فوراً، اس زور سے جو کاٹا
تکلیف اس کو پہنچی اور ہاتھ تھرتھرایا

بندوق ہل گئی تو خالی گیا نشانہ
چیونٹی نے فاختہ کو، یوں موت سے بچایا

گولی جونہی چلی تو، وہ اڑ گئی شجر سے
احسان جو کیا تھا، وہ اس کے کام آیا

چیونٹی بہت ہی خوش تھی، جب زندگی بچائی
احساں کا بدلہ اس نے احسان سے چکایا

ورلڈ کپ کرکٹ

ٹائم ٹیبل

پانچواں، عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ ۲۲ فروری سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں شروع ہو رہا ہے۔ ٹورنامنٹ میں پاکستان، بھارت، آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز، نیوزی لینڈ، سری لنکا، زمبابوے، انگلستان اور جنوبی افریقہ کی ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔ ٹورنامنٹ کا مفصل پروگرام یہ ہے۔

۲۲ فروری	انگلستان بمقابلہ بھارت	پرتھ	آسٹریلیا (ڈے / نائٹ)
	نیوزی لینڈ بمقابلہ آسٹریلیا	آکلینڈ	نیوزی لینڈ
۲۳ فروری	ویسٹ انڈیز بمقابلہ پاکستان	میلبورن	آسٹریلیا
	سری لنکا بمقابلہ زمبابوے	نیو پلائی ماؤتھ	نیوزی لینڈ
۲۵ فروری	نیوزی لینڈ بمقابلہ سری لنکا	ہملٹن	نیوزی لینڈ
۲۶ فروری	آسٹریلیا بمقابلہ جنوبی افریقہ	سڈنی	آسٹریلیا (ڈے/نائٹ)
	پاکستان بمقابلہ زمبابوے	ہوبرٹ	آسٹریلیا
۲۷ فروری	انگلستان بمقابلہ ویسٹ انڈیز	میلبورن	آسٹریلیا (ڈے / نائٹ)
۲۸ فروری	بھارت بمقابلہ سری لنکا	مکے	آسٹریلیا
۲۹ فروری	ویسٹ انڈیز بمقابلہ زمبابوے	بربین	آسٹریلیا
	نیوزی لینڈ بمقابلہ جنوبی افریقہ	آکلینڈ	نیوزی لینڈ
یکم مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ بھارت	بربین	آسٹریلیا
	انگلستان بمقابلہ پاکستان	ایڈیلیڈ	آسٹریلیا
۲ مارچ	سری لنکا بمقابلہ جنوبی افریقہ	ویلنگٹن	نیوزی لینڈ
۳ مارچ	نیوزی لینڈ بمقابلہ زمبابوے	نیپیئر	نیوزی لینڈ
۴ مارچ	پاکستان بمقابلہ بھارت	سڈنی	آسٹریلیا

۵ مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ انگلستان	سڈنی	آسٹریلیا
۶ مارچ	نیوزی لینڈ بمقابلہ جنوبی افریقہ	کرائسٹ چرچ	نیوزی لینڈ
۷ مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ سری لنکا	ایڈیلیڈ	آسٹریلیا
	بھارت بمقابلہ زمبابوے	ہملٹن	نیوزی لینڈ
۸ مارچ	پاکستان بمقابلہ جنوبی افریقہ	برسبین	آسٹریلیا
	نیوزی لینڈ بمقابلہ ویسٹ انڈیز	آکلینڈ	نیوزی لینڈ
۹ مارچ	انگلستان بمقابلہ سری لنکا	بیلارٹ	آسٹریلیا
۱۰ مارچ	زمبابوے بمقابلہ جنوبی افریقہ	کینبرا	آسٹریلیا
	ویسٹ انڈیز بمقابلہ بھارت	ویلنگٹن	نیوزی لینڈ
۱۱ مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ پاکستان	پرتھ	آسٹریلیا (ڈے / نائٹ)
۱۲ مارچ	انگلستان بمقابلہ جنوبی افریقہ	میلبورن	آسٹریلیا (ڈے / نائٹ)
	نیوزی لینڈ بمقابلہ بھارت	ڈونیڈن	نیوزی لینڈ
۱۳ مارچ	ویسٹ انڈیز بمقابلہ سری لنکا	بیری	آسٹریلیا
۱۴ مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ زمبابوے	ہوبرٹ	آسٹریلیا
۱۵ مارچ	بھارت بمقابلہ جنوبی افریقہ	ایڈیلیڈ	آسٹریلیا
	پاکستان بمقابلہ سری لنکا	پرتھ	آسٹریلیا
	نیوزی لینڈ بمقابلہ انگلستان	ویلنگٹن	نیوزی لینڈ
۱۸ مارچ	آسٹریلیا بمقابلہ ویسٹ انڈیز	میلبورن	آسٹریلیا (ڈے / نائٹ)
	انگلستان بمقابلہ زمبابوے	البری	آسٹریلیا
	نیوزی لینڈ بمقابلہ پاکستان	کرائسٹ چرچ	نیوزی لینڈ
۲۱ مارچ	سیمی فائنل	آکلینڈ	نیوزی لینڈ
۲۲ مارچ	سیمی فائنل	سڈنی	آسٹریلیا
۲۵ مارچ	فائنل	میلبورن	آسٹریلیا

طالبانِ
علم و ادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ۔ سیرت طیبہ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجاز مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل ۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرت اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :۔ گرین گائیڈ اکیڈمی ۔ ۱۱۲ ۔ ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱٦۔

دسمبر ۹۱ء کے شمارے میں شائع ہونے والے کارٹونز پر یہ خوبصورت انعامی کیپشن ہمارے جس ساتھی نے بھی لکھے وہ اپنا نام لکھنا بھول گئے۔

ادارہ

اور نہ دو بیرے کو ٹپ۔

اس ڈاکٹر کو تو کسی ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔

آ بیل مجھے مار۔

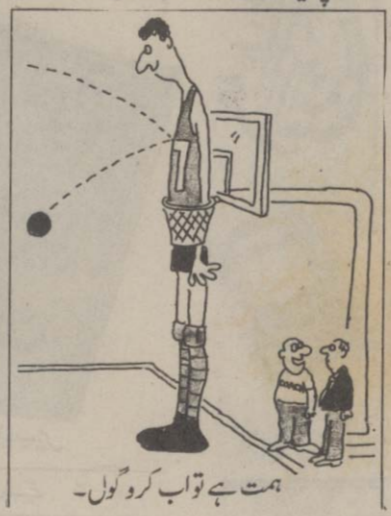

ہمت ہے تو اب کرو گول۔

یہ عالم شوق کا۔

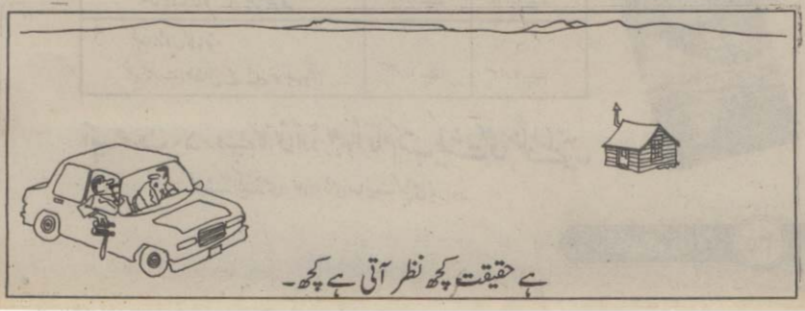

ہے حقیقت کچھ نظر آتی ہے کچھ۔

طاقت، توانائی اور صحت
احمد مُربّہ جات کی بدولت

احمد کے مُربّہ جات تازہ اور معیاری پھلوں سے طبی اُصولوں کے عین مُطابق تیار کئے جاتے ہیں۔ اِن کا باقاعدہ اِستعمال طاقت اور توانائی پیدا کر کے آپ کو چُست اور صحت مند رکھتا ہے۔

چوہے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

ادارہ

کیلیفورنیا (امریکہ) کی رہنے والی ۱۰ سالہ بریان والبسٹر اور ۹ سالہ کرسٹا سورنز کو ان کی سالگرہ پر جو ڈھیر سارے تحائف ملے ان میں چند سفید چوہے بھی شامل تھے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ سچ مچ کے جیتے جاگتے چوہے تھے جنہیں دیکھ کر بچوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

ہمارے ہاں تو آج تک چوہے صرف "بزدلی" کی علامت سمجھے جاتے ہیں یا پھر بلی کی خوراک۔ مگر امریکہ اور بہت سے مغربی ممالک میں چوہوں کی قدر و منزلت کا عالم کچھ اور ہے۔ وہاں یہ چوہے بھی بلی، کتے، یا طوطا مینا کی طرح پالنے والی جاندار اور خوبصورت مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔ بچے چوہے پال کر یا ان کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہاں چوہے بزدل نہیں ہوتے، انسانوں کے بہتر رویوں نے چوہوں کے دل میں موجود خوف کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

ایک امریکی بچی کیرن ہاڈسر نے بتایا کہ چوہے تو کتے اور بلیوں سے بہتر پالتو جانور ثابت ہوئے ہیں۔ یہ تاثرات اس امریکی بچی کے ہیں جس نے ۱۹۸۳ء میں "جدید چوہوں اور چوہیوں کی ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی۔

ایک بچے جیفر پینر یکسن نے بتایا کہ جب میں بیمار ہو جاؤں تو چوہے مجھ سے پیار کرتے ہیں اور میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ بریان والسٹر نے ایک بات بتا کر تو واقعی ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔

اس کا کہنا ہے کہ اس کے پالتو چوہے تو فٹ بال بھی کھیلتے ہیں، وہ اس طرح کہ بریان اور اس کا بھائی ایک انگور فوائل میں لپیٹ دیتے ہیں پھر وہ انگور کو چوہے کی طرف پھینکتے ہیں اور چوہے کمالِ ذہانت اور مستعدی سے انہیں گک کے ذریعہ واپس کر دیتے ہیں۔ آخر میں چوہے اس انگور کو فوائل سے نکال کر کھالیتے ہیں۔

دیکھا آپ نے چوہوں کو ذرا سا پیار کرنے سے وہ کس قدر مہذب بلکہ ہنر مند ہوگئے۔ اگر ہمارے ہاں بھی چوہے کو دیکھ کر لڑکیاں چیخنا چھوڑ دیں اور لڑکے چپل اٹھا کر ان کا پیچھا نہ کریں تو شائد یہ چوہے بھی سلیقہ مند ہو جائیں۔

ڈرے سہمے بدکتے خوف کھاتے
اُچھلتے کودتے چھپتے چھپاتے
یہ سب چوہے کوئی چکر چلاتے
"امریکہ" سے یہاں تک آ گئے ہیں

بغیر بالوں کا چوہا

کافی ماؤس

سیامی چوہا

سیاہ چوہا

چاپلوس چوہا

سفید چوہا

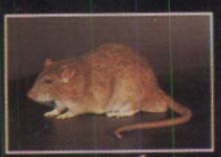

خرگوش نما چوہا

امریکہ کے شہر
کیلیفورنیا کی رہنے والی اس 8 سالہ
بچی "ایرن" کو چوہوں کو پالنے کا بے حد
شوق ہے
ایرن اپنے پالتو چوہوں کے ساتھ مختلف
نوعیت کے کھیل کھیل کر بہت خوش
ہوتی ہے
ایک بازو کو بلند کر کے چوہے کو ہتھیلی
سے گردن تک لانا اور پھر دوسرا بازو
اُونچا کر کے چوہے کو بلند ہتھیلی تک
لے جانا ایرن کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

ہو سکے تو یہ بھی عادت ڈال لیں آپ بھی دو چار چوہے پال لیں

کیلی فورنیا کے چند بچّے
جنہوں نے چوہوں کو اپنا
مستقل دوست بنا لیا ہے

چوہوں سے
ار کریں
ہے آپ کو
ار کریں گے

ن شیئرز
امریکی بچّہ

ایمانداری زندہ باد

احسان الحق حقانی

علاؤالدین کو پہلی بار اسلام آباد کی سیر کا موقع ملا تھا۔ وہ اپنے چچا جان اشرف کے ہاں آیا تھا جو ایک سرکاری دفتر میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اشرف چچا کا بڑا بیٹا عثمان علاؤالدین کا ہم عمر تھا۔ اور گہرا دوست بھی۔ آج کل چونکہ اسکول بند تھے، اس لئے عثمان اور علاؤالدین کا زیادہ تر وقت اسلام آباد کی سیر میں گزرتا۔ سب سے پہلے وہ شکر پڑیاں گئے جہاں سے پورے شہر کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ علاؤالدین کو اسلام آباد بہت ہی پسند آیا۔ یہاں کے صاف ستھرے محلے اور حد نگاہ تک سیدھی لکیر کی طرح سڑکیں۔ سرسبز پہاڑ اور گھنے جنگلات غرض ہر چیز نہ صرف علاؤالدین کے لئے نئی تھی بلکہ بے حد پُرکشش بھی۔ شکر پڑیاں میں وہ دیر تک اس درخت کے سائے میں کھڑا رہا جسے شاہ فیصل شہید نے ۱۹۷۴ء میں لگایا تھا۔

"بھئی چلو پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" عثمان نے کہا۔ اور وہ پھر دونوں اپنی پرانی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فیصل مسجد کی طرف چل پڑے۔ راستے میں علاؤالدین سوچوں میں گم تھا۔ وہ عثمان کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا جو ایسے خوبصورت شہر کا باسی تھا۔ اسلام آباد پاکستان کا جدید ترین شہر ہے جو مکمل منصوبہ بندی کے تحت تعمیر ہو رہا ہے۔ یہاں کی اکثر سڑکوں اور شاہراہوں کے دونوں جانب بلند و بالا

درخت ہیں۔ اور درمیان میں سرسبز پودے یا خوبصورت پھول۔ عثمان پوری رفتار سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا، لیکن پھر بھی جب وہ فیصل مسجد پہنچے تو عصر کی نماز پڑھی جاچکی تھی۔ اس لئے انہوں نے اکیلے ہی نماز پڑھ لی۔ علاؤالدین کی اس مسجد میں نماز با جماعت پڑھنے کی خواہش تھی اس لئے بادل ناخواستہ عثمان کو مغرب کا انتظار کرنا پڑا۔

انتظار کے لمحات گزارنے کے لئے عثمان نے ایک بہترین تجویز پیش کی کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی سیر کی جائے جو فیصل مسجد کے عقب ہی میں واقع ہے۔ اس یونیورسٹی میں تقریباً ۴۶ اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے مسلمان طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اس یونیورسٹی میں پاکستانی طلبہ کو ایف اے اور ایف ایس سی کے بعد داخلہ ملتا ہے۔ اور یہاں پڑھنے والے طلبہ نہ صرف انگریزی بول سکتے ہیں بلکہ عربی زبان پر بھی مکمل عبور رکھتے ہیں۔ آخر اسلامی یونیورسٹی ہے۔ اس جامعہ میں ایل ایل بی، ایل ایل ایم، ایم ایس سی (معاشیات) اور پی ایچ ڈی تک تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور یہ نہ صرف نام کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ہے بلکہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں کے نظام تعلیم کو ہم صحیح معنوں میں اسلامی نظام تعلیم کہہ سکتے ہیں۔ عثمان اور علاؤالدین سیدھے یونیورسٹی کی لائبریری میں گئے۔ یونیورسٹی تو بند تھی کیوں کہ شام ہو رہی تھی لیکن لائبریری کھلی تھی۔ لائبریری میں قدم رکھتے ہی علاؤالدین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنی بڑی اور خوبصورت لائبریری اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خوبصورت قالین اور ائیر کنڈیشنڈ ہال، بڑی بڑی الماریوں میں بے شمار موضوعات پر لاکھوں کتابیں موجود تھیں۔ لائبریری دیکھنے کے بعد وہ دعوۃ اکیڈمی گئے۔ اکیڈمی تو بند تھی لیکن اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مثلاً یہ جان کر علاؤ الدین کو خاص طور پر بہت ہی خوشی ہوئی کہ یہ اکیڈمی دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن حکیم اور اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرتی ہے اور پھر ان ترجموں کو روس اور امریکہ جیسے ممالک میں بھیجتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اکیڈمی مساجد کے اماموں اور فوج کے افسروں کے لئے تربیت کا بھی اہتمام کرتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کام کرتی ہے کہ روس چین سری لنکا اور فلپائن جیسے غیر اسلامی ممالک کے مسلمان نوجوانوں کو اپنے خرچ پر پاکستان بلاتی ہے اور ان کو اسلام کے بارے میں تعلیم دیتی ہے۔ علاؤالدین خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اسے پاکستان واقعی ایک اسلامی، فلاحی اور نظریاتی ملک لگنے لگا جہاں اسلام کی تبلیغ کے لئے اتنا ٹھوس کام ہو رہا تھا۔

مغرب کی اذان ہوگئی تو وہ فیصل مسجد چلے گئے۔ جہاں ملیشیا کا ایک نوجوان نماز پڑھا رہا تھا۔ ایک تو اس کی آواز میں بے پناہ مٹھاس تھی اور دوسری بات یہ کہ اس نے نماز میں ایسی آیات کی تلاوت کی

کہ علاؤالدین کے آنسو بہنے لگے۔

"زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہیں، اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں۔ مسلمانو! تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ جس پر خود عمل نہیں کرتے۔ اللہ کو بہت ہی بُرا لگتا ہے کہ کوئی شخص ایسی بات کرے جس پر وہ خود عمل نہیں کرتا۔ اللہ کو تو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جہاد کرتے ہیں۔" (سورہ الصف) نماز کے بعد علاؤالدین کی حالت بہت بدلی بدلی سی تھی۔ رہ رہ کر اس کے کانوں میں تلاوت کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ گھر جانے سے پہلے وہ دونوں بازار گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ کتابوں کی ایک دکان میں گھس گئے۔ دکان سے نکلتے وقت علاؤالدین کئی کتابیں خرید چکا تھا۔ عثمان کے ہاتھوں میں بھی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جس کا نام تھا "پہاڑی کے چراغ"۔ کتابیں خریدنے کے بعد دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔ چچا جان اور چچی جان شدت سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا، اور کافی دیر تک گپ شپ لگانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح ناشتے کی میز پر سب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اشرف چچا تو ناشتے کے بعد دفتر چلے گئے۔ اور علاؤالدین، عثمان کے ساتھ آج کی سیر کا پروگرام بنانے لگا۔ علاؤالدین بہت خوش اور ہشاش بشاش تھا۔ لیکن عثمان کچھ مضطرب اور بے چین سا لگ رہا تھا۔ علاؤالدین نے عثمان کی حالت محسوس کر لی۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیوں عثمان بھائی بہت پریشان لگ رہے ہو۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"نن نہیں تو۔" عثمان نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "..... کک ..... کوئی بھی بات نہیں۔ بھلا تمہاری وجہ سے میں کیسے پریشان ہو سکتا ہوں؟"

"نہیں میرے بھائی دال میں کچھ کالا ضرور ہے تم یوں ہی پریشان نہیں ہو۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔" علاؤالدین نے عثمان کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ دراصل اسے عثمان کی بے چینی نے کسی انجانے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔

"نہیں یار تم خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" عثمان نے مطمئن نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن علاؤالدین کے بے پناہ اصرار پر بالآخر اسے اصل بات بتانی پڑی۔

"دراصل علاؤالدین بھائی! کل رات مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی بلکہ گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ کیسے ادا کروں؟"

"بات کیا ہے عزیزم! ذرا تفصیل سے بتاؤ۔" علاؤ الدین نے بزرگوں کی سی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"یار وہ کتاب ہے ناں پہاڑی کے چراغ....."

"ہاں ہاں ہے تو سہی۔ کیا ہوا اسے؟" علاؤ الدین نے کہا۔ "وہ میں نے دکان سے چرائی تھی۔" عثمان نے شرم کے مارے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔ "کیا؟" علاؤ الدین نے ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکتے ہوئے کہا "یہ تو تم نے بہت ہی بُرا کیا ہے۔"

"ہاں ہاں بُرا کیا ہے۔ مجھے بھی احساس ہوا ہے۔ لیکن کتاب پڑھنے کے بعد"۔

"تمہیں یہ احساس کتاب چرانے سے پہلے ہونا چاہئے تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے؟" علاؤ الدین نے کہا۔

"سب پتا ہے یار۔" عثمان نے اکتاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟"

"ہاں! یہ زندگی میں تم نے پہلی مرتبہ عقل کی بات پوچھی ہے۔" علاؤ الدین بدستور مذاق کے موڈ میں تھا۔ "ہاں ایک بہترین ترکیب ہے میرے پاس۔" علاؤ الدین نے اچھلتے ہوئے کہا۔

"کیا ترکیب ہے؟" عثمان نے پوچھا "اب جلدی سے بتا بھی دو۔"

"ایسا کرتے ہیں۔ کہ آج ہم دوبارہ اسی دکان پر چلتے ہیں۔ مجھے کچھ دوسری کتابیں بھی خریدنی ہیں۔ اس دوران تم چوری کا مال واپس کر دینا اور آئندہ کے لئے توبہ کر لینا۔" علاؤ الدین نے ترکیب بتاتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ! زندگی میں پہلی مرتبہ عقل کی بات کی۔ صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے آخر۔" عثمان نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

کھٹارہ موٹر سائیکل کی برکت سے تھوڑی دیر بعد دونوں دوست کتابوں کی دکان میں پہنچ چکے تھے۔ عثمان نے چپکے سے کتاب واپس رکھ دی۔ اور علاؤ الدین دو چار مزید کتابیں خرید کر باہر نکلا تو دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علاؤ الدین نے کتابوں کے درمیان سے ایک پیکٹ نکالتے ہوئے عثمان کو پیش کیا۔

"لیجئے جناب! چوری سے نجات اور ایمانداری کے مظاہرہ پر مابدولت کی طرف سے تحفہ"۔ عثمان نے حیرت اور تجسس کے ساتھ پیکٹ کھولا۔ تو اس میں دو مزید کتابوں کے علاوہ "پہاڑی کے چراغ" نامی کتاب بھی موجود تھی۔ اور پھر دونوں نے مل کر نعرہ لگایا۔ "ایمانداری..... زندہ باد۔"

چیمپئنز ٹرافی

سال بہ سال

ضیاء الرحمٰن ضیاء

اولمپکس، ورلڈ کپ اور چیمپئنز ٹرافی ..... دنیائے ہاکی کے تین اہم ترین ٹورنامنٹس ہیں۔ چیمپئنز ٹرافی..... ہاکی کی چیمپئن ٹیموں کا ٹورنامنٹ ہے۔ یہ ٹورنامنٹ کئی اعتبار سے منفرد خصوصیات رکھتا ہے۔ اس میں صرف منتخب ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ یہ سنگل لیگ کی بنیاد پر کھیلا جاتا ہے۔ ہر ٹیم دیگر شریک ٹیموں سے ایک ایک میچ کھیلتی ہے۔ ہر میچ، حتیٰ کہ ہر گول کی اہمیت ہوتی ہے۔ ٹورنامنٹ میں بڑے سخت مقابلے دیکھنے میں آتے ہیں۔ عموماً نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ ٹورنامنٹ میں کئی پوزیشن کا تعین گول اوسط کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

ورلڈ کپ کی طرح چیمپئنز ٹرافی کا تحفہ بھی پاکستان نے دیا۔ چیمپئنز ٹرافی خالص چاندی سے بنائی گئی ہے۔ اس کا وزن تقریباً پانچ کلوگرام ہے۔ یہ ٹرافی پاکستان نے انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن کو عطیہ کے طور پر دی۔ اس ٹورنامنٹ کا ابتدائی نام "سپر ورلڈ کپ" تھا لیکن بعد میں یہ "چیمپئنز ٹرافی ورلڈ ہاکی ٹورنامنٹ" کہلانے لگا۔

پہلی چیمپئنز ٹرافی کا اہتمام ۱۹۷۸ء میں ۱۷ سے ۲۴ نومبر تک لاہور میں قدرتی گھاس پر کیا گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں پانچ ممالک پاکستان، آسٹریلیا، برطانیہ، نیوزی لینڈ اور اسپین نے

شرکت کی۔ پاکستان نے اپنے تمام چار میچ جیت کر آٹھ پوائنس حاصل کئے اور چیمپئنز ٹرافی جیت لی۔ آسٹریلیا کو چاندی اور برطانیہ کو کانسی کے تمغے ملے۔ نیوزی لینڈ نے چوتھی اور اسپین نے پانچویں پوزیشن حاصل کی۔

جنوری ۱۹۸۰ء میں دوسری چیمپئنز ٹرافی کا انعقاد کراچی میں کیا گیا۔ اس مقصد کیلئے کراچی کے ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم میں آسٹروٹرف بچھائی گئی، جو براعظم ایشیا میں لگائی جانے والی مصنوعی گھاس کا پہلا اسٹیڈیم تھا۔ ٹورنامنٹ میں مجموعی طور پر ۱۳۶ گول کئے گئے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ پاکستان نے اس ٹورنامنٹ میں بھی شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور ریکارڈ ۳۲ گول اسکور کئے۔ پاکستان کے خلاف ۹ گول کئے گئے۔ ہالینڈ کے مشہور زمانہ پنالٹی کارنر اسپیشلسٹ پال لیجنٹس نے ۱۵ گول کر کے ٹورنامنٹ کا ایک ریکارڈ قائم کیا جو اب تک برقرار ہے۔ پاکستان نے بھارت اور آسٹریلیا کو سات ایک سے شکست دی۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستان جرمنی اور آسٹریلیا نے اولین تین پوزیشن حاصل کیا۔

تیسری چیمپئنز ٹرافی ورلڈ ہاکی ٹورنامنٹ کی میزبانی کا اعزاز ایک بار پھر پاکستان کے حصے میں آیا۔ یہ مقابلے جنوری ۱۹۸۱ء میں کراچی میں منعقد کئے گئے۔ بھارت کی شرکت سے معذوری کی بنا پر برطانیہ کو مدعو کیا گیا۔ پال لیجنٹس کے عمدہ کھیل کے سبب ہالینڈ ٹرافی جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ آسٹریلیا نے چاندی اور جرمنی نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ پاکستان کی پوزیشن چوتھی رہی۔ پاکستان کی ناقص کارکردگی کا بنیادی سبب منظور حسین اور منور الزماں کا ٹیم سے اخراج تھا۔

چوتھی چیمپئنز ٹرافی کا اہتمام جولائی ۱۹۸۲ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم میں کیا گیا۔ سوویت یونین نے پہلی بار شرکت کی۔ ہالینڈ نے اپنے اعزاز کا کامیابی سے دفاع کیا۔ آسٹریلیا نے چاندی اور بھارت نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ پاکستان نے اس بار بھی چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان نے جرمنی کو ایک کے مقابلے میں چھ گول سے شکست دی لیکن وہ میزبان ہالینڈ سے دو کے مقابلے میں سات گول سے ہار گیا۔

اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء میں پانچویں چیمپئنز ٹرافی کا انعقاد ایک مرتبہ پھر کراچی میں کیا گیا۔ آسٹریلیا نے ٹورنامنٹ چیمپئنز کی طرح کھیلا اور ٹورنامنٹ جیت لیا۔ یہ کسی بین الاقوامی ٹورنامنٹ میں آسٹریلیا کی پہلی کامیابی تھی۔ اس ٹورنامنٹ میں ہالینڈ پہلے سے پانچویں نمبر پر آگیا۔ پاکستان نے چوتھی سے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان کے گول کیپر شاہد علی خان کو ان کے شاندار کھیل کے سبب "مین آف دی ٹورنامنٹ" قرار دیا گیا۔ کانسی کا تمغہ جرمنی نے حاصل کیا۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں چیمپئنز ٹرافی کا میزبان کراچی بنا۔ تیسری پوزیشن برطانیہ نے حاصل کی۔

پہلی پوزیشن کے لئے پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان مقابلہ تھا۔ آخری دن آسٹریلیا نے پاکستان کو صفر۔ ۲ سے شکست دے کر دوسری مرتبہ چیمپئنز ٹرافی جیت لی۔

چیمپئنز ٹرافی کی اگلی منزل آسٹریلیا کا شہر پرتھ تھا۔ جہاں یہ مقابلے نومبر ۱۹۸۵ء میں منعقد کئے گئے۔ میزبان آسٹریلیا نے مسلسل تیسری بار چیمپئنز ٹرافی جیت کر اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کرلی۔ اس ٹورنامنٹ میں پاکستان کی کارکردگی غیر متوازن رہی۔ پاکستان نے چیمپئن آسٹریلیا کو ایک کے مقابلے میں تین گول سے ہرایا اور ہالینڈ کو تین کے مقابلے میں چار گول سے شکست دی۔ لیکن وہ خلاف توقع بھارت اور جرمنی سے ہار گیا۔ برطانیہ سے مقابلہ برابر رہا۔ پاکستان نے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ برطانیہ دوسرے اور جرمنی تیسرے نمبر پر رہا۔

اپریل ۱۹۸۶ء میں آٹھویں چیمپئنز ٹرافی کراچی کے ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم میں منعقد کی گئی۔ یہ ہاکی کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب کسی ٹورنامنٹ کا انعقاد برقی قمقموں کی روشنی میں کیا گیا۔ ٹورنامنٹ میں جرمنی پہلے ہی چیمپئن بن چکا تھا۔ اگر آخری میچ میں پاکستان چار گول کے فرق سے کامیابی حاصل کرلیتا تو وہ چاندی کا تمغہ حاصل کرسکتا تھا لیکن پاکستان نے آسٹریلیا کو ۳۔۱ سے شکست دی۔ پاکستان اور آسٹریلیا کے پوائنس تو برابر ہوگئے لیکن بہتر گول اوسط کی بنا پر آسٹریلیا نے دوسری اور پاکستان نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

جون ۱۹۸۷ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم کے مضافات ایمسٹلوین میں منعقدہ نویں چیمپئنز ٹرافی میں پہلی بار آٹھ ممالک مدعو کئے گئے۔ جرمنی نے حسب سابق ٹرافی جیت لی۔ ہالینڈ نے دوسری اور آسٹریلیا نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان نے اپنی تاریخ کا سب سے خراب کھیل پیش کیا۔ پاکستان اپنے سات میچوں میں سے صرف ایک میچ جیتنے میں کامیاب ہوسکا۔ پاکستان نے آٹھ ملکوں کے ٹورنامنٹ میں بمشکل ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ اس سے قبل ۱۹۸۶ء میں لندن کے ورلڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ میں پاکستان کا بارہ ملکوں میں گیارہواں نمبر تھا۔

مارچ اپریل ۱۹۸۸ء میں دسویں چیمپئنز ٹرافی لاہور کے نوتعمیر شدہ دنیا کے سب سے بڑے ہاکی اسٹیڈیم میں منعقد کی گئی۔ ٹورنامنٹ کے آخری میچ میں اگر پاکستان آسٹریلیا کے مقابلے پر کامیاب ہوجاتا تو ٹرافی پاکستان کی ہوجاتی لیکن میچ ایک ایک گول سے برابر رہا۔ یوں جرمنی نے مسلسل تیسری مرتبہ فتحیاب ہوکر اپنی ہیٹ ٹرک مکمل کرلی۔ پاکستان نے چاندی اور آسٹریلیا نے کانسی کا تمغہ جیتا۔

جون ۱۹۸۹ء میں گیارہویں چیمپئنز ٹرافی کا میزبان جرمنی کا تاریخی شہر برلن تھا۔ پاکستان نے جرمنی اور سوویت یونین کو شکست دی لیکن

آسٹریلیا، ہالینڈ اور برطانیہ سے ہار گیا۔ آسٹریلیا نے پہلا، ہالینڈ نے دوسرا اور جرمنی نے تیسرا نمبر حاصل کیا۔ پاکستان کی چوتھی پوزیشن برقرار رہی۔

ستمبر ۱۹۹۱ء میں تیرہویں چیمپئنز ٹرافی کا انعقاد جرمنی کے شہر برلن میں ہوا۔ افتتاحی میچ پاکستان اور میزبان جرمنی کے درمیان کھیلا گیا جو انتہائی سنسنی خیز رہا۔ ماہرین کے نزدیک یہی ٹورنامنٹ کا فائنل تھا۔ جرمنی نے چار گول کئے جبکہ پاکستان تین گول کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ اگر پاکستان اس میچ کا ڈرا بھی کرلیتا تو چیمپئنز ٹرافی اس کی ہوجاتی۔ ٹورنامنٹ میں جرمنی نے پہلی، پاکستان نے دوسری اور ہالینڈ نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

چودھویں چیمپئنز ٹرافی کا اہتمام ۲۰ سے ۲۸ فروری تک ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم میں کیا جارہا ہے۔ اس مقصد کیلئے اسٹیڈیم کی تزئین و آرائش کی گئی اور نئی ٹرف بچھائی گئی ہے۔ کئی میچ برقی قمقموں کی روشنی میں کھیلے جائیں گے۔

اس ٹورنامنٹ میں بھی چھ ملک حصہ لے رہے ہیں جس میں ورلڈ چیمپئن، اولمپک اور چیمپئنز ٹرافی میں کانسی کا تمغہ جیتنے والی ہالینڈ، اولمپک چیمپئن برطانیہ، چیمپئنز ٹرافی چیمپئن اور اولمپک میں چاندی کا تمغہ حاصل کرنے والی ٹیم جرمنی، ایشین چیمپئن، ورلڈ کپ اور چیمپئنز ٹرافی میں چاندی کا تمغہ حاصل کرنے والی ٹیم پاکستان، ورلڈ کپ میں کانسی کا تمغہ جیتنے والی ٹیم آسٹریلیا اور ورلڈ کپ میں ساتویں پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیم فرانس شامل ہیں۔

اس مرتبہ چیمپئنز ٹرافی میں ہر ٹیم نہ صرف ایک دوسرے سے ایک ایک میچ کھیلے گی بلکہ پوزیشن کے تعین کیلئے بھی میچ ہوں گے۔ اس ٹورنامنٹ کے مقابلے آٹھویں بار پاکستان اور اور چھٹی بار کراچی میں منعقد کئے جارہے ہیں۔

۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں پاکستان کی ہاکی ٹیم انتہائی زوال کا شکار ہوگئی تھی۔ لیکن اب ایک نئی ٹیم تیار کرلی گئی ہے۔ اس سلسلے میں قومی ہاکی ٹیم کے منیجر اصلاح الدین نے بڑی محنت کی ہے۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم کا شمار دنیا کی تین بہترین ٹیموں میں کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان نے پنالٹی کارنر کی روایتی کمزوری پر بھی قابو پالیا ہے اور خالد بشیر ایک پنالٹی کارنر اسپیشلسٹ کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ توقع ہے کہ پاکستان، اس مرتبہ چیمپئنز ٹرافی جیتنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

چیمپئنز ٹرافی ورلڈکپ ہاکی ٹورنامنٹ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۹۱ء ... ایک جائزہ۔

چیمپئنز ٹرافی	تاریخ	شہر	ملک	ممالک کی تعداد	پہلی	دوسری	تیسری	چوتھی	پانچویں	چھٹی	ساتویں	آٹھویں
پہلی	۱۷ تا ۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء	لاہور	پاکستان	پانچ	پاکستان	آسٹریلیا	برطانیہ	نیوزی لینڈ	اسپین	.....	.....	.....
دوسری	۳ تا ۱۱ جنوری ۱۹۸۰ء	کراچی	پاکستان	سات	پاکستان	جرمنی	آسٹریلیا	ہالینڈ	بھارت	اسپین	برطانیہ	.....
تیسری	۹ تا ۱۶ جنوی ۱۹۸۱ء	کراچی	پاکستان	چھ	ہالینڈ	آسٹریلیا	جرمنی	پاکستان	اسپین	برطانیہ	.....	.....
چوتھی	۶ تا ۱۳ جون ۱۹۸۲ء	ایمسٹرڈیم	ہالینڈ	چھ	ہالینڈ	آسٹریلیا	بھارت	پاکستان	جرمنی	سوویت یونین	.....	.....
پانچویں	۲۸ اکتوبر ۴ نومبر ۱۹۸۳ء	کراچی	پاکستان	چھ	آسٹریلیا	پاکستان	جرمنی	بھارت	ہالینڈ	نیوزی لینڈ	.....	.....
چھٹی	۷ تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء	کراچی	پاکستان	چھ	آسٹریلیا	پاکستان	برطانیہ	ہالینڈ	نیوزی لینڈ	اسپین	.....	.....
ساتویں	۱۶ تا ۲۴ نومبر ۱۹۸۵ء	پرتھ	آسٹریلیا	چھ	آسٹریلیا	برطانیہ	جرمنی	پاکستان	ہالینڈ	بھارت	.....	.....
آٹھویں	۴ تا ۱۱ اپریل ۱۹۸۶ء	کراچی	پاکستان	چھ	جرمنی	آسٹریلیا	پاکستان	برطانیہ	بھارت	ہالینڈ	.....	.....
نویں	۱۹ تا ۲۸ جون ۱۹۸۷ء	ایمسٹلوین	ہالینڈ	آٹھ	جرمنی	ہالینڈ	آسٹریلیا	برطانیہ	ارجنٹائن	اسپین	پاکستان	سوویت یونین
دسویں	۲۵ مارچ تا یکم اپریل ۱۹۸۸ء	لاہور	پاکستان	چھ	جرمنی	پاکستان	آسٹریلیا	سوویت یونین	اسپین	برطانیہ	.....	.....
گیارہویں	۱۰ تا ۱۸ جون ۱۹۸۹ء	برلن	جرمنی	چھ	آسٹریلیا	ہالینڈ	جرمنی	پاکستان	برطانیہ	بھارت	.....	.....
بارہویں	۱۷ تا ۲۴ نومبر ۱۹۹۰ء	میلبورن	آسٹریلیا	چھ	آسٹریلیا	ہالینڈ	جرمنی	پاکستان	سوویت یونین	برطانیہ	.....	.....
تیرہویں	۱۳ تا ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ء	برلن	جرمنی	چھ	جرمنی	پاکستان	ہالینڈ	آسٹریلیا	برطانیہ	سوویت یونین	.....	.....
چودہویں	۲۰ تا ۲۸ فروری ۱۹۹۲ء	کراچی	پاکستان	چھ	.....							

کوئز کہانی

قسط نمبر ۳

گرین کارڈ

اُسامہ بن سلیم

کوئز کہانی آپ کی معلومات ہی کا نہیں ذہانت کا بھی امتحان ہے، اس مہماتی کہانی کو غور سے پڑھئے اور اس میں موجود دس معلوماتی غلطیوں کی نشاندہی کیجئے۔ نہ صرف نشاندہی بلکہ تصحیح بھی کیجئے۔ اپنے جوابات ایک کاغذ پر لکھ کر ہمیں ۱۰ مارچ سے قبل بھجوا دیجئے۔ تمام درست جوابات میں سے تین ساتھیوں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دیا جائے گا جبکہ بقیہ نام ذہانت کے اعتراف کے طور سے شائع بھی کئے جائیں گے۔ معلومات اور ذہانت کے اس انوکھے مقابلے کا انداز آپ کو کیسا لگا۔؟ ضرور لکھئے۔

اپنے جواب بھجواتے ہوئے یہ بات مت بھولئے کہ جواب کے ساتھ اس مقابلے میں شرکت کا کوپن بھی آنا ضروری ہے جو آخری صفحات میں موجود ہے۔ (مرتب)

دانش، ذیشان، حسن اور انعم گزشتہ ایک ہفتے سے اپنے گھر پہ نہیں تھے۔ یہ چاروں اپنے امی ابو کے ساتھ خالد ماموں کے ہاں آگئے تھے۔ جہاں شاہد ماموں کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شاہد ماموں چونکہ امی کے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور اب انہی کی شادی کا فرض ادا

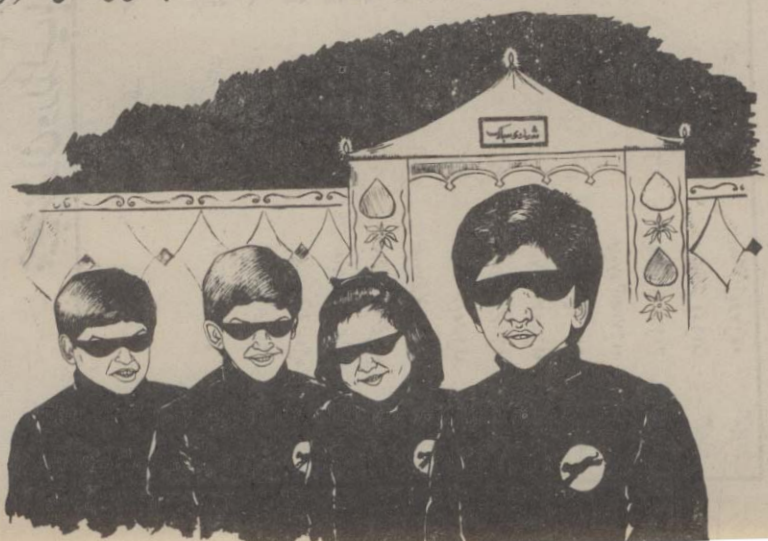

تھے۔ گھر کا ہر فرد بے حد خوش تھا خوشی سے سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ مہندی والی رات جب دلہن کے گھر والے مہندی لے کر پہنچے تو ڈھولک کی آوازیں اور گانوں کے شور نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتنوں سے سجی ہوئی مہندی، مہندی پر بکھرے ہوئے پھول اور پھولوں کے بیچوں بیچ لگی ہوئی روشن موم بتیوں کے ساتھ جب لڑکیوں اور بچوں کی قطار گھر کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی تو ویڈیو فلم بنانے والے کی تیز روشنی آن ہوئی اور مہمانوں کی فلم بننا شروع ہوگئی۔ ہر مہمان جب ویڈیو کیمرے کے سامنے سے گزرتا تو ایک مصنوعی مسکراہٹ یا کوئی خصوصی پوز بناتا ہوا گزرتا۔ فائزہ ممانی کی دوست راحیلہ کا تو بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ تو کیمرے کے سامنے سے لمحے بھر کو بھی نہیں ہٹتی۔ راحیلہ نے کسی کام کے بہانے رک کر ویڈیو فلم کے لئے پوز بنایا۔ ادھر ویڈیو والے نے بھی زیوروں سے سجی بلکہ لدی پھدی راحیلہ کی فلم کو خصوصی توجہ سے بنایا۔

ایک ایک کر کے مہمان اندر آگئے۔ اس سے پہلے کہ رسموں کا آغاز ہوتا مختلف نسوانی آوازیں سنائی دیں..... دانش..... !! دانش !! ذیشان ! حسن !! انعم انعم !! کہاں کھو گئے..... ؟؟ کہاں ہو دانش ؟؟ یہ آوازیں امی اور صبیحہ خالہ کی تھیں۔ مگر یہ چاروں وہاں ہوتے تو جواب دیتے۔

ہر طرف دیکھ لیا گیا۔ کونوں کھدروں کی تلاشی لی گئی۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا بلکہ گلی اور محلے کے ہر گھر سے پتہ کرالیا مگر ان چاروں کا سراغ نہ ملا۔

مہندی کی رسمیں روک دی گئیں اور ان چاروں بچوں کی تلاش شروع ہوگئی۔ پوری تقریب بدمزہ ہوگئی..... اسلم خالو بھی غصے میں بڑبڑانے لگے..... "ابے چلے گئے ہوں گے کم بخت کہیں جاسوسی کرنے۔" ..... جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہنا شروع کر دیا۔ اس پوری صورت حال میں انجم صاحب اور ان کی اہلیہ بے حد پریشان تھے۔ غصہ اور پریشانی ان کے چہروں سے نمایاں تھے۔ انجم صاحب نے فون کے ذریعے اپنے دوست نقاش اور شاہ جی کے گھروں سے بھی پتہ کر لیا مگر یہ بچے وہاں بھی نہ تھے۔

ابھی بچوں کی تلاش کا سلسلہ جاری تھا کہ شور مچ گیا..... آگئے..... آگئے..... چاروں آگئے۔ دانش، ذیشان، حسن اور انعم بڑے مزے سے ٹہلتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ ان کے آتے ہی ہر شخص ان پر برس پڑا۔ کہاں چلے گئے تھے؟ بتا کر کیوں نہیں گئے؟ بیوقوف، احمق وغیرہ وغیرہ..... سبھی نے اپنا اپنا غصہ اتارا مگر بچوں کے چہروں پر ایسا اطمینان تھا جیسے وہ اس صورتحال کے لئے پہلے سے تیار ہوں۔ چاروں نے بڑی معصومیت سے کہا کہ ہم تو برابر والی مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے۔ اس جواب پر سب کے منہ لٹکے

صرف نماز کے لئے ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک بچوں کا گھر سے غائب رہنا انجم صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور انعم تو یوں بھی مسجد نہیں جاتی۔ بچے جھوٹ بھی نہیں بولتے۔ تو پھر آخر چکر کیا ہے؟ وہ بار بار دانش اور ذیشان سے پوچھ رہے تھے۔ "ابے پھر تو کوئی چکر نہیں چلا دیا جاسوسی کا۔" "نہیں ابو" دانش نے بڑی معصومیت سے جواب دیا اور ابو کو ان کی بات پر یقین کرنا پڑا۔

ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک غائب رہنے کے بعد بچے واپس تو آگئے تھے مگر ان کا رنگ ڈھنگ بدلا ہوا تھا۔ چاروں کے چہروں پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ یہ لوگ تقریب کے کسی لمحے سے محظوظ نہیں ہو رہے تھے بلکہ ان کی مستقل نظریں صرف ایسے لوگوں کی چہروں کو ٹٹول رہی تھیں جو ان کے رشتے دار نہ تھے مگر مہندی کی رسم میں شریک تھے۔

چکر کیا ہے.....؟ اسے کوئی نہ سمجھ سکا، البتہ واجد ماموں جو انہیں کچھ دیر قبل مسجد کے قریب پولیس کی گاڑی کے پاس کسی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے، وہ بڑی سنجیدگی سے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مہندی کی رسمیں اختتام کو پہنچیں، آخر میں کھانا کھایا گیا لیکن اس پورے عرصے میں دانش، حسن اور ذیشان کے چہروں کی سنجیدگی میں کوئی کمی نہ آئی، البتہ انعم بیچاری سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی سہیلی کے ساتھ کھیل کود میں مگن ہوگئی۔

تقریب ختم ہوگئی، مہمان جانے لگے، ویڈیو فلم والا آخر تک فلم بناتا رہا۔ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی۔ اگلا دن نکاح کی تقریب کا تھا۔

.....○.....○.....

شہر کے سب سے بڑے تجارتی سبزہ زار پر شامیانوں کی موجودگی اور جلتے بجھتے برقی قمقمے اس جگہ کو شادی کی تقریب ثابت کر رہے تھے۔

آج دانش، ذیشان، حسن اور انعم کے سب سے چھوٹے ماموں کی تقریب نکاح کا دن تھا۔ شادی گاہ کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ ڈیکوریشن کا خوبصورت سامان اور تزئین کے خصوصی اہتمام نے پورے منظر کو بہت حسین بنا دیا تھا۔

مہمانوں کی بڑی تعداد پنڈال میں پہنچ چکی تھی۔ اجلے اجلے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے مرد اور رنگ برنگے چمکتے کپڑوں میں مہکتی ہوئی خواتین کے علاوہ تتلی کی طرح ادھر سے ادھر منڈلاتے ہوئے بچوں

نے شادی کی تقریب کے منظر کو اور بھی سہانا بنا دیا تھا۔

تقریب میں شرکت کے لئے پاکستان کے مختلف حصوں سے بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے بلکہ امریکہ اور برطانیہ سے بھی بڑی تعداد میں مہمان آئے تھے۔ شکیل خالو، جمیلہ خالہ، بینا، اسماء، سمیرا اور حارث گزشتہ روز ہی مشہور امریکی ایئر لائن ایرو فلوٹ سے کراچی پہنچے تھے۔

مہمانوں کی آمد سے قبل ویڈیو والے اپنے کیمرے اور روشنی کی گنوں کے ساتھ استقبال کی جگہ موجود تھے اور ہر آنے والے کی فلم پوری توجہ سے بنا رہے تھے۔

شادی کی تقریب میں موجود سبھی لوگ منظر کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اکثر لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے، مگر گہما گہمی کے اس ماحول میں چار بچے ایسے تھے جو کسی سے بات تک نہیں کر رہے تھے۔ یہ چاروں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ اتنے فاصلے پر کہ یہ جب چاہیں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں یا کوئی اشارہ کر سکیں۔ یقیناً یہ دانش، ذیشان، حسن اور انعم کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان چاروں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ بھی شادی کی تقریب کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھے۔ فوجی انداز کی خاکی اور سبز رنگ کی پینٹ پر چاروں نے سیاہ رنگ کے سوئٹر پہن رکھتے تھے۔ ہر سوئٹر پر جھپٹتے ہوئے تیندوے کی سرخ تصویر بنی ہوئی تھی۔ رات کی دعوت میں ان کی آنکھوں پر لگے ہوئے کالے شیشوں والے چشمے بھی بظاہر بڑے عجیب معلوم ہو رہے تھے۔ جو بات سمجھ میں آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ ان چاروں بچوں پر جاسوسی کا خبط بری طرح سوار ہو چکا ہے، اور یہ کہ آج کی تقریب میں بھی وہ کسی غیر معمولی مشن پر ہیں۔

تقریب کے اکثر شرکاء ان سب کو غور سے دیکھتے اور اپنے چہرے کے تاثر سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

کچھ دیر بعد جب یہ چاروں تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ پر جمع ہو کر سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنے لگے تو شرارتی بچوں کی ایک ٹولی قریب آئی اور چاروں پر فقرے کسنے لگی۔

ذیشان، دانش اور حسن کے ذہن میں ایک لمحے کو یہ خیال آیا کہ وہ کرائے کے ایکشن دکھا کر، بدتمیز بچوں کے دماغ درست کر دیں مگر پھر انہیں فوراً ہی کرائے کلب میں دہرایا ہوا یہ قول یاد آیا کہ "ہم کرائے کو کبھی بھی ذاتی جھگڑے، رنجش یا غصے کی حالت میں انتقامی کارروائی کے لئے استعمال نہیں کریں گے۔" اس خیال کے آتے ہی ان کا غصہ جاتا رہا۔ وہ اس بات سے بھی بہ خوبی واقف تھے کہ کرائے میں حملہ صرف مظلوموں کی مدد کے لئے کیا جا سکتا ہے یا پھر ناگہانی صورتحال میں اپنے دفاع کے لئے۔

دانش، ذیشان اور حسن نے سب کو نظر انداز کیا اور ایک طرف چل دیئے۔ ان کے طرز عمل میں

آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ خاموش خاموش تھے۔ اکثر ایک دوسرے سے دور۔ ان کی آنکھوں پر لگا ہوا کالا چشمہ بھی بے وجہ نہیں تھا۔ ان کی نظریں کچھ لوگوں کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو۔

روایتی تقریبات کی طرح یہ تقریب بھی تاخیر کا شکار ہو چکی تھی۔ رات کے ۹ بج چکے تھے مگر ابھی تک نکاح کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ کھانے کا سلسلہ تو ابھی بہت دور تھا۔ وقت گزارنے کے لئے لوگ اپنے اپنے حلقوں میں مختلف انداز کی گفتگو کر رہے تھے۔ انجم صاحب کے قریبی دوست اکبر بھٹی صاحب اپنے دوستوں کو اپنے دورہ جاپان کا احوال سنا رہے تھے۔ ان کے اظہار کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ ایک لمحے کو دانش، ذیشان اور حسن اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو کر ان کی گفتگو سننے لگے۔ بھٹی صاحب نے بتایا کہ "جاپان میں ان کا قیام بیجنگ کے ایک ہوٹل میں رہا۔ ایک ماہ کے قیام کے دوران انہوں نے دریائے ایمزان، ناگاپربت کی چوٹی اور نیاگرا کا آبشار بھی دیکھا۔ جاپان سے واپسی پر سنگاپور میں ہونے والے مشہور عالمی EXPO میں شرکت کی۔ جاپان کی باتیں ہونے لگیں تو سرفراز صاحب نے بتایا کہ وہ آج کل جاپان کے سابق صدر لیو شاؤ چی کے حالات زندگی پڑھ رہے ہیں۔ اعجاز صاحب نے سارک ممالک میں جاپان کی شرکت کو بھی اچھا شگون قرار دیا..... یوں بات سے بات نکلتی رہی اور گھوم پھر کر کسی نہ کسی انداز..... سے جاپان کا ذکر آتا رہا۔

اچانک انعم نے ذیشان کے سر پر ٹھونگا مارا اور کہا..... "یہ ڈیوٹی ہو رہی ہے؟؟" ..... ذیشان نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا۔ واقعی وہ بھٹی صاحب کے سفرنامے کے سحر میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ذیشان اور دانش نے حسن کو ساتھ لیا اور شادی گاہ کے اس حصے کی جانب چل دیئے جہاں خواتین کا اجتماع تھا اور جہاں ویڈیو والا بڑی مستعدی سے خواتین کی فلم بنا رہا تھا۔

حسن نے ویڈیو والے سے پوچھا "بھائی تمہارا کیمرہ کتنے روپے کا ہے؟"

کیمرہ مین نے حسن کو غور سے دیکھا اور کہا کہ روپے کا تو مجھے پتہ نہیں۔ یہ کیمرہ میں نے سعودی عرب سے ۵۰۰ درہم کا خریدا تھا۔

درہم کا سن کر حسن کو خیال آیا کہ اس کے پاس بھی شکیل خالو کے بھجوائی ہوئی امریکی کرنسی "پونڈ" کے کچھ نوٹ موجود ہیں۔

حسن نے کیمرہ مین سے کچھ بے تکلف ہونا چاہا مگر وہ حسن کو لفٹ کرائے بغیر دوسری جانب چل دیا۔ کیمرہ مین مسلسل خواتین کے کلوز اپ بنانے میں مصروف تھا جبکہ چاروں بچوں کی آنکھیں یہاں پر بھی کسی کا تعاقب کر رہی تھیں۔

رات ۱۰ بجے کہیں جاکر نکاح کا مرحلہ آیا اور رات ۱۱ بجے کہیں جاکر مہمانوں کو ظہرانے کے لئے بلایا گیا۔ کھانے کے بلاوے پر بھوک سے بے حال لوگ کھانے پر یوں لپکے جیسے پہلی بار کچھ کھانے کو ملا ہو۔

نکاح کی تقریب خدا خدا کر کے اختتام کو پہنچی کچھ رسوم کے بعد رخصتی ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

..... □ .....

دوسرے روز صبح صبح اخبار کے دوسرے صفحے پر جلی حروف کے ساتھ شائع ہونے والی ایک خبر نے پورے گھر کو چونکا دیا۔

"شادی سے واپسی پر سیٹھ ستار کے اہل خانہ کا قیمتی زیور لوٹ لیا گیا۔"

انجم صاحب نے بلند آواز سے یہ خبر پڑھی تو پورا گھر چونک گیا۔ دانش، حسن اور ذیشان نے اس خبر کو پوری توجہ اور خصوصی دلچسپی سے پڑھا۔

"..... تو گویا راحیلہ آنٹی کا زیور ڈاکو لے اڑے....." ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا.....

"بڑی شو مار رہی تھیں نا!! بار بار پوز بنا رہی تھیں۔ ویڈیو والے کے سامنے" حسن کے منہ سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ دانش صاحب اچھل پڑے۔

شادی کی تقریبات کا ایک ایک منظر اس کی نظر کے سامنے گھوم گیا۔

"یہ زیور مل سکتا ہے....." دانش نے بڑے یقین سے کہا

"کیسے مل سکتا ہے۔" پاگل ہوگئے ہو کیا!! کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکل بھی نہ دینا۔" ان کی امی نے ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا۔

..... □ .....

حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے روز ولیمے کی دعوت سے قبل مجرم گرفتار ہو چکے تھے اور سارا زیور بھی مل گیا تھا۔

ولیمے کی تقریب میں ایس ایس پی وسیم بتا رہے تھے کہ آج کل شہر میں ہونے والی شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کرنے والے بہت سے لوگ واپس جاتے ہوئے لٹ جاتے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ

وہ شادی کی تقریبات کو رات ۱۰ بجے تک ہر صورت میں ختم کر دیں تاکہ سڑکیں ویران ہونے سے قبل ہی لوگ گھروں کو واپس جاسکیں۔

خواتین شادی بیاہ کے موقعہ پر معمولی زیور پہنیں اور اس کی بھی حفاظت کا اہتمام کریں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ

خواتین اجنبی لوگوں اور خصوصاً ویڈیو کیمرہ کے سامنے آنے سے گریز کریں۔

گزشتہ روز ہونے والی ڈکیتی کی واردات کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ سیٹھ ستار کی بیٹی مس راحیلہ نے بہت زیادہ زیور پہن رکھا تھا۔ ویڈیو فلم والے ڈاکو کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کو مہندی کی رسم کی وہ کیسٹ فراہم کی جس میں مس راحیلہ کا زیور اس کے چہرے کے کلوز اپ ان کے اہل خانہ اور گھر کی گاڑی وغیرہ سب کچھ دکھایا گیا تھا۔ اس فلم کی مدد سے دوسرے روز نکاح کے بعد ڈاکوؤں نے مس راحیلہ کی گاڑی کا تعاقب کیا اور راستے میں زیور لوٹ لیا۔

ایس ایس پی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے متوقع واردات کے خطرے کے پیش نظر چار ذہین بچوں کو پہلے روز ہی الرٹ کر دیا تھا۔ ان بچوں کی نشاندہی پر ہم نے مشتبہ لوگوں کو گرفتار کیا۔ دانش کو یقین تھا کہ ویڈیو والا ہی مجرموں کا سرغنہ ہے۔ دانش کا شک درست ثابت ہوا۔ ویڈیو والا گرفتار ہوا اور اسے بالآخر سب کچھ بتانا پڑا۔

ایس ایس پی صاحب نے دانش، حسن، ذیشان اور انعم کی ذہانت کی تعریف کی اور انہیں پولیس کی طرف سے انعام دلوانے کا وعدہ کیا۔ ولیمہ کے تقریب میں سب لوگ ان چاروں بچوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور انہیں شاباش بھی دے رہے تھے۔ بچوں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی انکل مومن نے کی جو آرمی میں لیفٹیننٹ کمانڈر ہیں۔ شادی کی تقریب میں موجود شریر بچوں کی ٹولی اب دانش، ذیشان، حسن اور انعم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر ارشد موٹو تو آگے بڑھ بڑھ کر حسن سے دوستی کرنا چاہ رہا تھا۔

..... □ .....

کوئز کہانی نمبر ۲

کے صحیح جوابات اور انعام حاصل کرنے والے ساتھیوں کے نام صفحہ نمبر ۶۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

اسے پلو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

کرشمہ

اظہر نیاز

قسط نمبر ۲

جواد ذیشان کا دوست تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو، آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا ایک بار اس نے اسکول میں اچانک یہ شور مچا کر کہ چھت گرنے والی ہے، پوری کلاس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور واقعی تھوڑی دیر بعد چھت گر گئی۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج بھی وہ ذیشان سے ملنے آیا تو آغا عمران سے اس کی ملاقات ہو گئی جنہوں نے جواد کو خوش خبری سنائی کہ وہ حسب خواہش ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ایک دوست ٹی وی پروڈیوسر کے نام تعارفی خط بھی دیا۔ مگر جواد نے انہیں جو بات بتائی اسے سن کر وہ ڈر سے گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

آغا عمران دفتر پہنچے تو پہلا ٹیلی فون آئی جی صاحب کا تھا۔

"آغا عمران! تمہیں ایک اہم کیس سونپا جا رہا ہے۔ تم اکیڈمی سے اپنے آپ کو فارغ سمجھو۔ تمہیں اپنی ٹیم خود بنانے کی اجازت ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ تم انسپکٹر شعیب کا نام لو گے۔ میں اس کے لئے بھی آج ہی ہدایات بھیج رہا ہوں۔ وہ حسب معمول تمہارے نائب کا کام کرے گا۔ فائل آج کی ڈاک سے تمہیں مل جائے گی۔ اب تمہیں خود دیکھنا ہے کہ ان لوگوں کا قلع قمع کیسے کرتے ہو۔ میری طرف سے تمہیں ہر قسم کے ممکن اور قانونی اختیارات حاصل ہوں گے ..... اور کوئی بات؟"

"نو سر! اگر کوئی بات پوچھنا ہوگی تو میں آپ کو فائل پڑھنے کے بعد زحمت دوں گا۔"

"اور ہاں مسٹر آغا عمران! میں نے ایس ایس پی راؤ اقبال سے کہہ دیا ہے، تمہارے اسٹاف اور دیگر ضروریات کے لئے وہ نگرانی کریں گے۔ تم براہ راست بھی ان سے رابطہ کر سکتے ہو۔ رائٹ؟"

"تھینک یو سر۔"

"گڈ لک"، آئی جی صاحب نے بھرپور مسرت کے ساتھ کہا اور ٹیلی فون منقطع ہو گیا۔

..... □□□ .....

"ہیلو ہیلو۔"

"جی میں جواد بول رہا ہوں۔ انکل آغا عمران نے شاید آپ سے بات کی ہو میرے سلسلے میں۔ مجھے ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔" دوسری طرف ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر انصاری تھے۔

"ہاں۔ آغا صاحب نے مجھ سے بات کی تھی۔ بیٹے آپ اس طرح کریں کہ کسی صبح دس بجے آڈیشن کے لئے آجائیں۔"

"لیکن سر۔ میں تو کل اسکول جاؤں گا۔ دس بجے تو نہیں آسکتا۔ البتہ اسکول ٹائم کے بعد آسکتا ہوں۔"

دوسری طرف انصاری صاحب اس طرح ہنسے تھے کہ کل کا چھوکرا جو ابھی ٹی وی اسٹیشن میں داخل نہیں ہوا۔ ابھی سے وقت دے رہا ہے۔ اور وہ بھی ٹی وی پروڈیوسر کو۔

"ٹھیک ہے جناب، آپ کے پاس آغا عمران کی پرچی ہے۔ آپ اسطرح کریں کہ اسکول ٹائم کے بعد جب آپ کے پاس وقت ہو، آجائیں۔ آنے سے پہلے فون کر لیجئے گا۔"

جواد اسکول سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ کھانا کھایا اور ہاتھ منہ دھو کر دوسرے کپڑے پہنے اور امی کو ساتھ لے کر ٹی وی اسٹیشن پہنچ گیا۔

ان کا خیال تھا کہ ان کی گاڑی سیدھی ٹی وی اسٹیشن کے اندر چلی جائے گی۔ پتا چلا کہ انہیں دروازے پر ہی روک لیا گیا۔

"جی ہمیں انصاری صاحب نے بلایا ہے۔"

"کون۔ انصاری صاحب؟" بڑی بڑی مونچھوں والے سکیورٹی گارڈ نے بندوق لہراتے ہوئے پوچھا۔

"کمال ہے۔" جواد نے کہا۔ "تم ٹی وی اسٹیشن میں ہو کر بھی انصاری صاحب کو نہیں جانتے۔

جناب وہ جو پروڈیوسر ہیں۔ ڈرامہ کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آپ گاڑی باہر کھڑی کریں اور اس کھڑکی پر جا کر بات کریں۔"

خیر گاڑی واپس موڑی گئی۔ باہر گاڑی کھڑی کرنے کے لئے سایہ بھی نہیں تھا۔ اور گاڑیاں بھی دھوپ میں کھڑی تھیں۔ جواد کی امی نے بھی گاڑی دھوپ میں کھڑی کر دی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت کھڑکی پر ایک مشہور آرٹسٹ لپنا پاس بنوا رہے تھے۔ تب جواد کو پتہ چلا کہ پاس سب کے لئے ضروری ہے۔ چاہے وہ پہلے دن ٹی وی آیا ہو یا مشہور آرٹسٹ ہو۔

استقبالئے پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ان سے نام پوچھا اور اندر ٹیلی فون پر انصاری صاحب سے بات کی۔ اور پھر پاس بنانے لگا۔

"شناختی کارڈ؟"

"جی میں ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا۔" جواد نے معصومیت سے کہا۔ کلرک کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے بغیر شناختی کارڈ کے ہی پاس بنا کر ان کے حوالے کر دیا۔

جواد کو ٹی وی اسٹیشن کے اندر داخل ہونا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ راہ داری سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک آدمی کو روک کر انصاری صاحب کے کمرے کا پوچھا۔

"وہ۔ سامنے۔ تیسرا کمرہ۔"

انصاری صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی اسکرپٹ پڑھ رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ، سامنے چائے کی پیالی، پاؤں مع جوتوں کے میز کے اوپر۔ وہ بالکل ٹی وی پروڈیوسر لگ رہے تھے۔ انہوں نے عینک کو ناک پر سے اتارا اور بڑے ڈرامائی انداز میں مخاطب ہوئے۔

"تو آپ ہیں مسٹر جواد۔ اور آپ غالباً جواد کی امی ہیں۔؟"

"جی میں جواد ہوں اور یہ غالباً نہیں حقیقتاً میری امی ہیں۔"

"بھئی واہ۔" انصاری صاحب نے داد دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کا آڈیشن تو ہو گیا۔"

"کیا آپ کو بھی ٹی وی میں کام کرنے کا شوق ہے۔" انصاری صاحب نے جواد کی امی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ میں کیا کام کروں گی۔ میں تو یہ اپنے بیٹے جواد کی وجہ سے چلی آئی ہوں۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ تشریف رکھئے۔ چائے پیجئے گا؟"

"جی نہیں شکریہ۔"

"ہاں تو بیٹے۔ یہ لو اسکرپٹ اور پہلے اسے اطمینان سے پڑھ لو۔"

جواد نے اسکرپٹ لے لیا اور پڑھنے لگا۔

یہ اسکرپٹ پروگرام کی پہلی قسط تھی جس میں بچے اپنا ایک چلڈرن کلب بناتے ہیں کہ ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے کیونکہ بڑے بچوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اور بچے ان تمام برائیوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو بڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بچہ جھوٹ بولتا ہے تو اسے یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ اس میں بڑوں والی عادتیں آتی جا رہی ہیں تو وہ فوراً معافی مانگتا ہے کہ وہ بچہ ہے اور بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ اور ایسی تمام عادتیں جو خراب ہیں اور بڑوں میں پائی جاتی ہیں ان کو نہیں اپنائیں گے۔ اور بچے عہد کرتے ہیں کہ بڑے ہو کر بھی ان عادتوں سے دور رہیں گے، اچھے کام کریں گے، سچ بولیں گے، چھوٹوں کا خیال کریں گے، بڑوں کی عزت کریں گے، ماں باپ کا کہنا مانیں گے، پرندوں، درختوں اور جانوروں سے پیار کریں گے۔ خوبصورت ماحول کے لئے کوشش کریں گے۔ پھر یہ کلب یہ بھی طے کرتا ہے کہ مختلف ہم نصابی سرگرمیوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ بچوں کو ایکٹنگ سکھانے، موسیقی سکھانے اور مختلف کھیل سکھانے کی کلاسوں کا انتظام کیا جائے گا۔ پھر سب ممبران اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ سب سے پہلے ایکٹنگ سکھانے کی کلاس کا اہتمام کیا جائے۔

جواد نے اسکرپٹ پڑھ لیا تو انصاری صاحب نے کہا۔ "تم چیئرمین چلڈرن کلب کا کریکٹر پڑھو گے۔ میں تمہارے ساتھ دوسرے کریکٹر پڑھتا ہوں۔ تو چلو شروع ہو جاؤ۔"

جواد نے پڑھنا شروع کیا!

"ایک کار سڑک پر رواں ہے۔"

"نہیں نہیں ایسے نہیں۔" انصاری صاحب نے جواد کو روکا۔ "یہ جو منظر نامہ یا ہدایات ہیں اسے نہیں پڑھنا ہے بلکہ ایسے کر کے دکھانا ہے۔ اور ڈائیلاگ بولتے وقت ایسا نہ لگے کہ آپ اسکرپٹ پڑھ رہے ہیں بلکہ اس طرح پڑھیں جیسے آپ بولتے ہیں دیکھیں میں آپ کو بول کر دکھاتا ہوں۔"

پھر انصاری صاحب نے خود چیئرمین چلڈرن کلب کے ڈائیلاگ بول کر دکھائے۔

"بس بس۔ اب میں سمجھ گیا۔" جواد نے کہا۔

اور پھر جواد نے چیئرمین چلڈرن کلب کے ڈائیلاگ ایسے بولے کہ انصاری صاحب عش عش کر اٹھے۔

"ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔ تم تو پیدائشی ایکٹر ہو۔ سمجھ لو تمہارا انتخاب اس کردار کے لئے کر لیا

گیا ہے۔" اس کے بعد انصاری صاحب نے ایک آڈیشن فارم بھرا۔ جواد کا نام، پتہ، ٹیلی فون نمبر وغیرہ لکھا اور اسکرپٹ کی ایک کاپی جواد کو دے دی۔

"یہ لو، لے جاؤ اور اسے خوب پڑھو۔ چند دنوں میں جب تمام کردار فائنل ہو جائیں گے تو میں تمہیں ٹیلی فون پر اطلاع دے دوں گا۔ پھر سب بچے مل کر ریہرسل کریں گے۔ دو یا تین دن ریہرسل کریں گے اور پھر شوٹنگ۔"

"شوٹنگ کتنے دن چلے گی؟" جواد نے پوچھا۔

"صرف دو دن۔ ایک دن ان ڈور۔ ایک دن آؤٹ ڈور۔"

"تو اجازت؟" جواد کی امی نے پوچھا۔

"جی بالکل۔" انصاری صاحب نے کہا۔ "وہ آپ کے پاس سلپ ہو گی۔"

"جی، یہ۔" جواد نے اپنی پتلون کی جیب سے پاس نکال کر دیا۔ انصاری صاحب نے سلپ لے کر اس پر دستخط کر دیئے۔ یہ باہر گیٹ پر واپس کر دیجئے گا۔

"سر۔ ایک بات تو بتائیں،" جواد نے انصاری صاحب سے پوچھا۔

"اگر بجلی چلی جائے تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ہم جنریٹر چلا لیتے ہیں۔"

"اگر جنریٹر خراب ہو جائے تو؟"

"تو۔ تو مشکل ہو گی۔ صاف ظاہر ہے نشریات رک جائیں گی۔ بجلی کے آنے کا انتظار کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ جنریٹر جلد از جلد ٹھیک ہو جائے۔۔۔۔

کیوں؟" انصاری صاحب سوال بنے ہوئے تھے۔

اور اس سے پہلے کہ جواد کوئی جواب دیتا۔ بجلی چلی گئی۔ ٹیلی ویژن کی نشریات رک گئیں۔

انصاری صاحب نے کہیں فون کیا۔ "بھئی اتنی دیر۔ جنریٹر کیوں نہیں چلا رہے؟" سر، جنریٹر بھی خراب ہو گیا ہے۔ اسے ٹھیک کیا جا رہا ہے۔"

انصاری صاحب حیرت سے جواد اور اس کی امی کو جاتے دیکھ رہے تھے۔ جو گیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے، انصاری صاحب کسی انجانی قوت کے زیر اثر گیٹ کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ آخر انہوں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ اور خود ہی بڑبڑانے لگے۔

"مسٹر انصاری، یہ اتفاق ہے، محض اتفاق۔ اور کچھ بھی نہیں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ اور کام کرو۔"

جاری ہے

کوئز کہانی فروری ۱۹۹۲ء کے صحیح جوابات

(۱)..... چورنگی میں بائیں سے نہیں بلکہ دائیں جانب سے آنے والی گاڑیوں کو راستہ دیا جاتا ہے۔ (۲)..... سڑک کو پار کنگ کے نشان والی جگہ سے نہیں بلکہ زیبرا کراسنگ کے نشان والی جگہ سے پار کرنا چاہئے۔ (۳)..... سڑک کو بھاگ کر عبور کرنا غلط ہوتا ہے۔ (۴)..... تھانے میں آئی۔ ایف۔ آر۔ نہیں ایف۔ آئی۔ آر درج کرائی جاتی ہے۔ (۵)..... LHR-3540 کراچی کا نہیں لاہور کا نمبر ہے۔ (۶) مارشل آرٹ کرائے افریقی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کا کھیل ہے جاپانی چینی، کورین اور ساؤتھ ایشیا وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ (۷) والٹ ڈزنی شاعر نہیں بلکہ ایک کارٹون فلم کے موجد اور بہت بڑے تخلیقی آرٹسٹ تھے (۸) دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی، امریکہ اور دیگر مغربی و ایشیائی ممالک شریک تھے۔ (۹) اسکنڈی نیوین ملکوں میں سوئیڈن، ناروے، فن لینڈ، ڈنمارک شامل ہیں۔ (۱۰)..... آنکھ مچولی ماہنامہ رسالہ ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱)..... حسن مصطفیٰ انصاری، ایف بی۔ ایریا۔ کراچی (۲)..... سید نعیم الحق. نارتھ کراچی (۳)..... انیلا مبین، نواب شاہ۔

صحیح جوابات دینے والے ساتھیوں کے نام

(۱)..... محمد بابر اقبال، کراچی (۲)..... سید محمد عارف. کراچی (۳)..... سمنان آخوند، کراچی (۴)..... یاور زمان، حیدر آباد (۵)..... تابندہ بخاری، کراچی (۶)..... سید احسن علی. کراچی (۷)..... ثوبیہ افشین کراچی (۸)..... عثمان خلیل، کراچی

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱)..... عامر سلیم، راولپنڈی (۲)..... وقاص بن حسن، بہاولپور (۳)..... اظہر رضا اجنبی، کراچی (۴)..... سراج لمان اللہ، کراچی (۵)..... ثمینہ شمس، کراچی (۶)..... فراز احمد، سکھر (۷)..... خواجہ عماد الدین، کراچی (۸)..... سحر اقبال، کراچی (۹)..... معتصم، سکھر (۱۰)..... محمد سعید، ساہیوال (۱۱)..... ساجد حبیب، کراچی (۱۲)..... محمد احمد، حیدر آباد (۱۳)..... ریاض احمد سولنگی، کوٹری (۱۴)..... محمد عاصم، کوٹری (۱۵)..... فاطمہ ولی، کراچی

حیرتناک فتح

خالدبخاری

محمد بن قاسم کم عمر سپہ سالار تھے، جب کہ راجہ داہر تجربہ کار اور طاقتور حکمران لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی بھی محاذ پر راجہ داہر نے فتح حاصل نہیں کی۔ سندھ کی حدود میں پہنچتے ہی سب سے پہلے لشکرِ اسلام اور برہمی فوجوں کا مقابلہ کٹرپور کے مقام پر ہوا، مگر راجہ داہر کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس موقع پر کئی سندھی بدھ مت کے ماننے والوں نے محمد بن قاسم کو مبارک باد دی اور کئی جوان لشکرِ اسلام میں دیئے۔ آگے چل کر دوسری لڑائی ادمابیل "لس بیلا" میں ہوئی، وہاں کے عوام نے اسلامی لشکر کا ساتھ دیا، اور راجہ داہر کی فوجوں کو شکست ہوئی، تیسری لڑائی دیبل کے مقام پر ہوئی، دیبل کا قلعہ دیبل مندر کے پجاری کے تعاون سے فتح ہوا۔ اس کے بعد چوتھی لڑائی نیرون لوٹ (موجودہ حیدر آباد) کے مقام پر ہوئی، اس میں راجہ داہر کی فوجیں جنگ نہ کر سکیں اور قلعہ آسانی سے فتح ہوگیا۔ پانچویں لڑائی سیوسان "سیومن" قلعے کے باہر ہونے والی تھی مگر بدھ بھکشوؤں نے قلعے کی چابی محمد بن قاسم کو دے دی یوں بغیر

کسی جنگ کے قلع فتح ہو گیا، آگے چل کر کاکا کے مقام پر چھٹی لڑائی ہوئی جس میں راجہ داہر کو عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے اور یہ علاقہ بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد لشکرِ اسلام سندھ کے دارالسلطنت، اروڑ پہنچا اور وہاں پر راجہ داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان خطرناک لڑائی ہوئی اس لڑائی میں راجہ داہر اپنی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ سفید ہاتھی پر سوار تھا اس کے ایک طرف اس کی رانی دیوی بائی اور اس کا بیٹا جیسیہ اور دوسری طرف اس کے وزراء تھے جو سیاہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر لڑائی لڑ رہے تھے۔

تیسرے دن راجہ داہر کے ہاتھ کو تیر لگا اور وہ بھاگ نکلا ہاتھی کے بھاگنے سے راجہ داہر اپنے ہاتھی کے پاؤں میں گر پڑا اور کچل کر ہلاک ہو گیا راجہ داہر کے لشکریوں کے پاؤں اکھڑ گئے، یہاں تک افراتفری ہوئی کہ جیسیہ اور سی ساگر جیسے سورما بھی بھاگنے لگے۔ اگرچہ راجہ داہر کی رانی نے انہیں حکم دیا کہ مردوں کی طرح لڑیں مگر انہوں نے بھاگنے میں اپنی عافیت سمجھی فوجوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر داہر کی رانی دیوی بائی کو سخت صدمہ ہوا اور اس نے خود کشی کر لی۔ ادھر اروڑ فتح ہوا اور محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا قلعہ بھی فتح کیا یہ ساتویں لڑائی تھی۔ اس کے بعد آٹھویں لڑائی مانھیلو، نویں جھٹ ڈیتھری، دسویں وینجنوٹ، گیارھویں سنجرپوں، بارھویں اوچ، اور تیرھویں ملتان میں لڑی گئی۔ ان جنگوں میں محمد بن قاسم فاتح ہوئے کسی ایک جنگ میں بھی راجہ داہر کی فوج مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکی جب کہ محمد بن قاسم کے پاس لشکر کم تھا اور اسلحے کے لحاظ سے بھی مسلمان سپاہی کمزور تھے اور سندھ ان کا اپنا وطن بھی نہیں تھا، ادھر سندھ راجہ داہر کا گھر بھی .... تھا اور اس کے فوجی بہترین اسلحے سے لیس تھے اور گنتی میں بھی زیادہ تھے۔ پھر بھی تیرہ محاذوں پر راجہ داہر اور اس کے سپہ سالاروں کو بدترین شکستیں نصیب ہوئیں۔

سندھ ۱۰ رمضان المبارک کو فتح ہوا اور برہمی سامراج کا دور ختم ہوا، راجہ داہر کی شکست اور محمد بن قاسم کی فتح کا واقعہ تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے، کیوں کہ ایک کم سن لڑکے نے اس وقت کی ایک بڑی طاقت راجہ داہر کو تیرہ شکستیں دیں، اور ایک جنگ بھی ایسی نہ ہوئی جس میں راجہ داہر کو فتح ہوئی ہو۔

چیزوں کی کہانی

کرسی

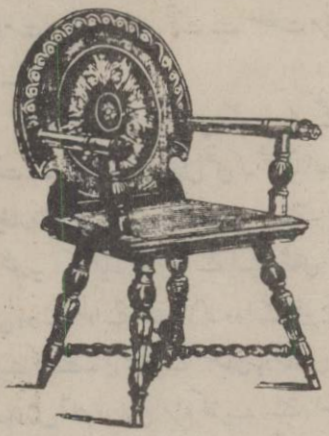

آصف فرخی

چلتے چلتے یا کھڑے کھڑے تھک جائیں تو جی چاہتا ہے کہ کہیں بیٹھ جائیں۔ ایسے میں کرسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مہربان اور آرام دہ کرسی آغوش کشادہ کئے ہوئے ہے۔ اس پر بیٹھ کر ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

لیکن یہ کرسی ہمیشہ سے موجود نہ تھی۔ بہت پرانے زمانوں میں، جب لوگ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے تھے اور ان کے گھر "اٹھاؤ چولہا" قسم کے تھے کہ آج یہاں کل وہاں، تو بیٹھنے کے لئے کرسی کا کوئی تصور نہ تھا۔ جب بیٹھنے کی ضرورت پڑتی تو فرش پر دھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ اٹھنے، بیٹھنے اور لیٹنے کے لئے زمین کافی تھی۔

مگر جلد ہی بیٹھنے کے معاملے میں فرق کیا جانے لگا۔ جوں جوں سماج کی ایک شکل بنتی گئی، تو اس میں لوگوں کے درجے متعین ہونے لگے۔ کچھ لوگ سردار اور محترم بڑے، اور کچھ کو نچلے درجے دیئے گئے۔ جو سردار اور محترم قرار پائے، وہ زمین سے اونچے ہو کر بیٹھنا پسند کرنے لگے۔

اونچے درجے کی نشانی کے طور پر قبیلے یا جتھے کے سردار کو ایسی جگہ پر بٹھایا جانے لگا جہاں بیٹھ کر وہ نمایاں ہو سکے۔ باقی سارے لوگ زمین پر بیٹھتے تو سردار کو پتھر کی چٹان پر بٹھایا جاتا۔

قبیلوں اور جتھوں نے بستی کی شکل اختیار کی اور بستیوں کے سردار، بادشاہ بن گئے تو ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی بلند تر ہوتی گئی۔ بادشاہ جس چیز پر

بیٹھتے تھے اسے شاہی تخت کہا جانے لگا، اور یہ تخت بادشاہ کے رعب دبدبے، طاقت اور مرتبے کی علامت بن گیا۔ شاہی تخت سے سلطنت مراد لی جانے لگی۔

اقتدار میں آتے ہی کرسی کے دن پھر گئے۔ تخت کے سامنے کس کی مجال تھی کہ ٹھہرتا؟ بادشاہ بیٹھا رہتا اور باقی سارے لوگ کھڑے رہتے۔ قدیم آشوریہ کے ایک بادشاہ نے اپنے شاہی تخت میں دو پہیے لگوالئے تھے، تاکہ وہ اٹھے بغیر جہاں چاہے جاسکے۔ برصغیر کے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں تمام درباری امراء کھڑے رہتے، صرف خاص خاص اشخاص کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ دربار میں بیٹھنے کی اجازت یا کرسی ملنا بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

بادشاہوں کے تخت، زر و جواہر سے مزین ہوتے اور ان کی طرح طرح سے آرائش کی جاتی۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کا تخت طاؤس کاری گری کا ایسا ہی نمونہ تھا، جس کی خوبصورتی کی آج تک مثال دی جاتی ہے۔ درباری امراء کے بیٹھنے کے لئے بھی طرح طرح کی مسندیں، چوکیاں اور نشستیں بنائی جاتی تھیں۔ قدیم تہذیبوں میں یہ کرسیاں قیمتی لکڑی کو تراش کر بنائی جاتیں، ان کے پائے اور ہتھے، شیر یا بیل کی شکل کے ہوتے۔ اور یہ خیال کیا جاتا کہ جو ان پر بیٹھے گا، وہ ان جانوروں کی سی طاقت حاصل کر لے گا۔

کرسیوں کا رواج سب سے پہلے مصر کے دولت مند لوگوں میں ہوا۔ کرسی، دربار سے نکل کر امراء کے گھروں میں آگئی۔ قدیم مصر کی یہ کرسیاں، دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتیں، ان میں بناوٹ کا کام ہوتا، اور ان کی پشت انسانی کمر کے لحاظ سے بنائی جاتی۔ یہ آرام دہ اور دلکش کرسیاں، آج اعلا فرنیچر کی کسی بھی دکان میں مہنگے داموں فروخت ہو سکتی ہیں اور کسی بھی جدید ڈرائنگ روم کی آرائش میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ پاؤں رکھنے کے لئے مصریوں نے چھوٹے اسٹول بنائے۔ ان اسٹولوں کو دشمن فوج کے سپاہیوں کی شکل کا بنایا جاتا۔ اس طرح وہ دشمن کے خلاف تلوار اٹھائے بغیر اسے اپنے قدموں تلے روندنے کا مزہ حاصل کر سکتے تھے۔ مصریوں نے تہہ ہو جانے والی کرسیاں بھی بنائی تھیں۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ بچے کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے چمڑے کے گدوں پر بیٹھتے۔

قدیم یونان اور روم میں بچے، اسٹولوں پر بیٹھنے لگے۔ کرسی اساتذہ، خواتین اور اہم شخصیات استعمال کرتی تھیں۔

جب چوتھی صدی عیسوی میں نیم وحشی قبائل کے ہاتھوں روم برباد ہو گیا تو رہائش کی یہ سہولتیں، مغرب کے ملکوں سے غائب ہو گئیں۔ عام آدمی بیٹھنے کے لئے معمولی انداز کی بنچیں اور اسٹول بلکہ بڑے صندوق بھی استعمال کرنے لگے۔ کرسی پر بیٹھنا صرف بادشاہوں، امراء اور گرجا کے بڑے پادریوں کا حق تھا۔ قدیم انگلستان کے نیم

روائتی بادشاہ آرتھر کے جنگ جو سورما ایک گول میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ اس لئے انہیں "گول میز کے سورما" کہا جاتا تھا۔ اہم مجلس میں صرف سب سے معزز شخص کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی، اور اسی لئے اجلاس کے سربراہ کو آج بھی "چیئرمین" (یعنی کرسی بردار) کہا جاتا ہے۔

تجارت اور جہاز رانی کے فروغ سے یوروپ میں دولت کی فراوانی ہوئی تو گھروں میں آسائش کے سامان کا استعمال بڑھنے لگا۔ کرسیاں عام طور پر استعمال ہونے لگیں۔ اس زمانے میں جیسی کرسیوں کا دستور تھا، وہ آج ہمیں بہت بے آرام معلوم ہوں گی۔ ان کرسیوں کی پشت سیدھی اور تنگ تھی اور بیٹھنے کی جگہ تھوڑی سی تھی۔ کرسیوں کو آرام دہ بنانے کے لئے ان پر چمڑا منڈھ کر اس کے اندر گھوڑے کے بال، یا کیل سے ٹھنکے ہوئے گدّے استعمال ہونے لگے۔

نت نئے نمونوں کی کرسیاں بننے لگیں۔ کچھ پر جھالر اور پھندنے ہوتے، کچھ پر نقش و نگار، اب کرسی بیٹھنے کی ہی نہیں، دیکھنے کی چیز بھی تھی۔

دوسو برس پہلے یوروپ میں بغیر ہتھے کی کرسیاں سامنے آئیں، جس پر دو آدمی اطمینان سے، بیٹھ کر بات چیت کر سکتے تھے۔ گدے والی کرسیوں نے ترقی کر کے زیادہ آرام دہ اور گدیلے صوفوں کی شکل اختیار کرلی۔

کرسی اور صوفے کو ہمارے معاشرے میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ مگر ہم لوگ ان کو دولت اور اعلا معیار زندگی کی نشانی سمجھنے لگے ہیں۔ مونڈھے اور پیڑھی پر بیٹھنا عام تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی، چار پایوں والی چھوٹی سی پیڑھی عام تھی۔ کرسی کے بجائے عام طور پر مونڈھے استعمال ہوتے۔ یہ سینٹھے یا سرکنڈے سے بنائے جاتے، اور ان کو آرام دہ بنانے کے لئے بکری کی کھال یا کپڑا لگا دیا جاتا۔ تخت اور چوکیاں عام تھے۔ بڑی بڑی مجالس میں فرشی نشست ہوتی تھی۔ دری اور چاندنی بچھ جاتی اور لوگ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھتے۔

پہلے پہل تخت کے آگے رکھی جانے والی چوکی کو کرسی کہا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ انگریزی وضع کی کرسی استعمال ہونے لگی۔ کسی گھر میں یا گاؤں میں کوئی معزز مہمان آجاتا تو کہیں سے مانگ مانگ کر کرسی لائی جاتی اور مہمان کو بیٹھنے کے لئے پیش کی جاتی۔ اب گھروں اور دفتروں میں اس کا استعمال عام ہے۔

کرسی نے کئی شکلیں بدلی ہیں۔ جھولنے والی کرسی، گھومنے والی کرسی، تہہ ہو جانے والی کرسی عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ سینما گھروں میں ایسی کرسیاں ہوتی ہیں جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتیں۔ بڑے بڑے سرکاری دفتروں میں رعب دار، لمبی چوڑی کرسیاں نظر آتی ہیں۔ ایسی کرسیاں اپنے بیٹھنے والوں سے بھی زیادہ بارعب اور مضبوط معلوم ہوتی ہیں۔

میں کیسے دل کو سمجھاؤں

شاھدہ صدف

ہمیشہ کوٹھیوں کے لان میں دن میرے گزرے ہیں
ہمیشہ چپکے چپکے میں نے اُن سے دوستی کی ہے
کہ اُن میں اور مجھ میں فاصلے دن رات جتنے ہیں
کھلونے قیمتی جن کے میرے جذبات جتنے ہیں
مگر اس دوستی کے درمیاں دیوار حائل ہے
یہاں لازم ہے مجھ پر ہر گھڑی "اوقات میں رہنا"
کسی نوشی کسی پنکی کسی ٹونی کی باتوں سے
محبت چپکے چپکے فاصلے کم کرنے لگتی ہے
جب ان کے امی ابو گھر سے باہر یا بزی ہوں تو
پھر ایسے میں ہماری بے تحاشہ بننے لگتی ہے
وہ اپنے خوبصورت ٹینک، گڑیاں اور غبارے
اٹھا لاتے ہیں باہر لان میں اور میں سجاتی ہوں
کبھی ہوتا ہے ایسا سب کا جی کرتا ہے کچھ کھائیں
تو میں مٹی کی ہانڈی میں مٹر چاول پکاتی ہوں (جو ہم سب مل کے کھاتے ہیں)

کوئی ٹافی میری جانب اچھلتی ہے
کسی چلتی ہوئی گڑیا کی چابی ٹوٹ جاتی ہے
تو یونہی وہ ہوا میں آدھی لٹکی جھولے جاتی ہے
اور ایسی بے سروپا بات پر ہم خوب ہنستے ہیں
خوشی کچھ اس طرح بانہوں میں بھر لیتی ہے ہم سب کو
میں کیا ہوں، کون ہوں، اور کس جگہ ہوں بھول جاتی ہوں
مگر یکدم اچانک جس طرح بھونچال آجائے
کسی گاڑی کا پٹ کھلتا ہے اور بیگم اترتی ہیں
تو وہ معصوم بھولے بھالے بچے دیکھ کر ان کو
یکایک بھاگ اٹھتے ہیں
میں رہ جاتی ہوں تنہا ڈانٹ اور پھٹکار سننے کو
بہت کچھ، کچھ روا کچھ ناروا وہ کہتی رہتی ہیں
میں سب کچھ سر جھکائے خامشی سے سنتی رہتی ہوں
اور اس کے بعد جب طوفان تھمتا ہے
تھکے قدموں سے جا گرتی ہوں ٹوٹی چارپائی پر
تو مجھ کو یاد آتا ہے
میں اِک نوکر کی بیٹی ہوں
میرا گھر میری دنیا بس یہی سرونٹ کوارٹر ہے
مگر میں کس کو بتلاؤں کسی کو کیسے سمجھاؤں
کہ میرا دل "یہ پاگل دل" بہت تکرار کرتا ہے
اسی اک بات پر اصرار کرتا ہے۔ یونہی رہ رہ کے استفسار کرتا ہے
"اگر سب لوگ چھوٹے لوگ ہوں کتنا مزہ آئے" ؟؟؟

ا۔ معروف

سلیمان احمد

تاریخی عمارتیں بیچنے والا

اگر آپ بازار جائیں تو آپ کے کانوں میں کچھ اس طرح کی آوازیں ضرور ٹکرائیں گی "اماں یہ لے لیجئے" "باجی ادھر آیئے یہ دیکھئے" "خالہ جی یہ دیکھ تو لیں آپ کو پسند آئے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ اور اکثر یہ چالاک و چرب زبان سیلز مین آپ کو ایسی چیزیں بھی خریدنے پر مجبور کر دیتے ہیں جنہیں آپ خریدنا نہ چاہتے ہوں یہ سیلز مین اپنی باتوں اور فقروں سے اپنا اور اپنی چیزوں کا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

آج ہم آپ کو ایک ایسے سیلز مین کے بارے میں بتاتے ہیں جس نے تاریخی عمارتیں جو قومی ورثہ سمجھی جاتی ہیں اپنے زور بیان سے فروخت کر دیں۔ جی ہاں تاریخی عمارتیں۔

یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے آرتھر فرگوسن لندن کے بیچوں بیچ ٹرافلگر اسکوائر پر کھڑا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو نیلسن کی یادگار کو محویت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ ٹرافلگر اسکوائر کے طلسماتی ماحول نے اس پر جادو سا کر دیا تھا اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ نیلسن کی یادگار کو چومنا شروع کر دے۔ آرتھر فوراً ایک گائیڈ بن کر اس شخص کے پاس پہنچا اور اسے ٹرافلگر اسکوائر کی تاریخ سے آگاہ کیا۔ آرتھر نے اس شخص کو بتایا کہ کس طرح ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں لارڈ نیلسن نے

ٹرافلگر کے مقام پر اسپین اور فرانس کی متحدہ فوج کو اپنی بے مثال بہادری سے شکست سے دوچار کیا۔ برطانیہ کا رہنے والا ہر شخص لارڈ نیلسن سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ وہ برطانیہ سے کرتا ہے آرتھر نے اسے ٹرافلگر اسکوائر کے بارے میں پرانی کہاوت بھی سنائی کہ اگر آپ کو برطانیہ میں کسی کی تلاش ہو اور آپ کو اس کا پتا بھی نہیں معلوم تو آپ ٹرافلگر پر آجایئے وہ شخص کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آئے گا۔ باتوں ہی باتوں میں آرتھر نے یہ معلوم کرلیا کہ یہ شخص امریکی ریاست نووا کا رہنے والا ہے اور کچھ دنوں کے لئے لندن آیا ہوا ہے امریکن کو اچھی طرح شیشے میں اتار لینے کے بعد اسے بتایا کہ اقتصادی زبوں حالی کے باعث ٹرافلگر اسکوائر پر موجود یہ یادگار، شیر، فوارے وغیرہ سب فروخت کئے جارہے ہیں اور موزوں گاہک کی تلاش کا کام اس کے ہی سپرد کیا گیا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ خریدار صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ذوق بھی ہو ان اشیاء کی قدر بھی کرسکے امریکن کے تو گویا دل کی کلی کھل گئی اس نے قیمت پوچھی آرتھر نے چھ ہزار پاؤنڈ کم از کم قیمت فروخت بتائی۔ امریکی شخص راضی ہوگیا اس نے چیک پر دستخط کرکے آرتھر کے حوالے کردیا۔ آرتھر نے امریکی کو چیک کی رسید دے کر ایک فرم کا پتا بتایا جو ان اشیاء کو اکھاڑ کر امریکہ تک پہنچانے میں اس کی مدد کرسکے اور پھر اس سے جدا ہوگیا۔

آرتھر سیدھا بینک پہنچا اور چیک کیش کرالیا امریکی اس فرم کے پاس گیا جس کا پتا آرتھر نے بتایا تھا۔ امریکی کو بتلایا گیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے تاہم آرتھر کی چرب زبانی کا جادو اتنا سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ اس نے یقین کرنے سے انکار کردیا بات جب پولیس تک پہنچی امریکی کو یقین آیا کہ وہ اپنی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

آرتھر نے آنے والے دن بڑے عیش سے گزارے پھر آرتھر کو تو چسکا پڑ گیا ایک امریکی نے بتایا کہ اس نے لندن کے مشہور بگ بین کے ایک ہزار پاؤنڈ ادا کئے ہیں جب کہ دوسرے نے بکنگھم پیلس دو ہزار پاؤنڈ میں خرید لیا ہے۔ ان تینوں واقعات نے آرتھر کو احساس دلایا کہ اس کے بہترین گاہک امریکی ہی ہوسکتے ہیں چنانچہ اس نے اپنا کاروبار امریکہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ واشنگٹن آیا جہاں اس نے پہلا ہی ہاتھ بڑا مارا اور وہائٹ ہاؤس کو ایک لاکھ ڈالر معاوضے پر ۹۹ سال کے لئے لیز پر دے دیا۔ پہلے سال کی لیز کی رقم اس نے بطور ایڈوانس وصول کرلی۔ یہ رقم اچھی خاصی تھی اور وہ چاہتا تو اپنی بقیہ زندگی ٹھاٹ سے گزارتا مگر اس نے اپنا کاروبار جاری رکھا۔

اس کا اگلا شکار سڈنی کا رہنے والا تھا جس کو اس نے بتایا کہ نیویارک کی بندرگاہ کو چوڑا کیا جارہا ہے اور مجسمہ آزادی اس کام کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ محض جذباتی وابستگی کو ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔

چنانچہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مجسمے کو فروخت کر دیا جائے۔ آسٹریلین نے مجسمہ خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی سودا ایک لاکھ ڈالر میں طے پا گیا تاہم آسٹریلیا سے رقم منگوانے میں کچھ وقت در کار تھا۔ اگلے چند دن آسٹریلوی شخص سڈنی سے رقم منگوانے کا بندوبست کرتا رہا اور آرتھر اس کو ہر ایسے شخص سے دور رکھنے کی کوشش کرتا رہا جو اسے اس سودے بازی سے باز رکھ سکے۔ تاہم سودے کی تکمیل کے دھن میں آخر کار آرتھر پر وہ کمزور لمحہ آ ہی گیا جو ہر مجرم پیشہ شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور آتا ہے۔اس نے مجسمے کے سامنے آسٹریلین کے ساتھ تصویر بنوالی اور یہی اس کے اختتام کا آغاز تھا۔

آرتھر کی بدقسمتی کہ آسٹریلیا سے رقم آنے میں دیر ہوگئی۔ آسٹریلین کو آرتھر کی باتوں پر شک سا ہونے لگا۔ آسٹریلین نے آرتھر کی چھان بین کرائی پھر وہ تصویر پولیس کو دے دی پولیس تو ویسے ہی قومی عمارات فروخت کرنے والے سیلز مین کی تلاش میں تھی۔ آرتھر گرفتار ہوگیا۔ آرتھر کو پانچ سال کی سزا ہوئی۔سزا کاٹ کر وہ ۱۹۳۰ء میں رہا ہوا اور لاس اینجلس چلا آیا۔ آرتھر کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔

ان سے ملئے

بن یامین

"سگ باش برادرِ خورد نہ باش۔"

فارسی کا یہ مقولہ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے لئے صحیح ہو مگر ہمارے معاملے میں سو فیصد غلط ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہوئے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ "سگ باش برادر...... یعنی کہ بڑا بھائی نہ باش۔ معلوم نہیں بڑے بھائی کو فارسی میں کیا کہتے ہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ، ہمیں اتنی فارسی تو کیا اردو بھی نہیں آتی۔ پہلا والا محاورہ بھی ہمیں اپنے چھوٹے بھائی ہی سے سننا نصیب ہوا تھا۔ آپ کو فارسی نہ آتی ہو تو اس کے معنی آکر ہمارے چھوٹے بھائی سے پوچھ لیجئے گا۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنی یہ دکھ بھری داستان آپ کو سنائیں اپنے چھوٹے بھائی کا تعارف کراتے چلیں۔

نام ان کا عمیر ہے۔ عمر تیرہ سال اور قد ساڑھے چار فٹ۔ یہ ان کا اصلی قد اور عمر ہے ورنہ ان کی ذہنی عمر اور علمی قد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی سی عمر میں انہوں نے تاریخ اور فلسفے سمیت ہر قسم کی کتابیں ہضم کر رکھی ہیں۔ بحث کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ گفتگو کے دوران مخاطب کو اس حد تک دِق کر دیتے ہیں کہ وہ بیچارا تپ دق میں مبتلا ہونے پر غور کرتا رہ جاتا ہے۔

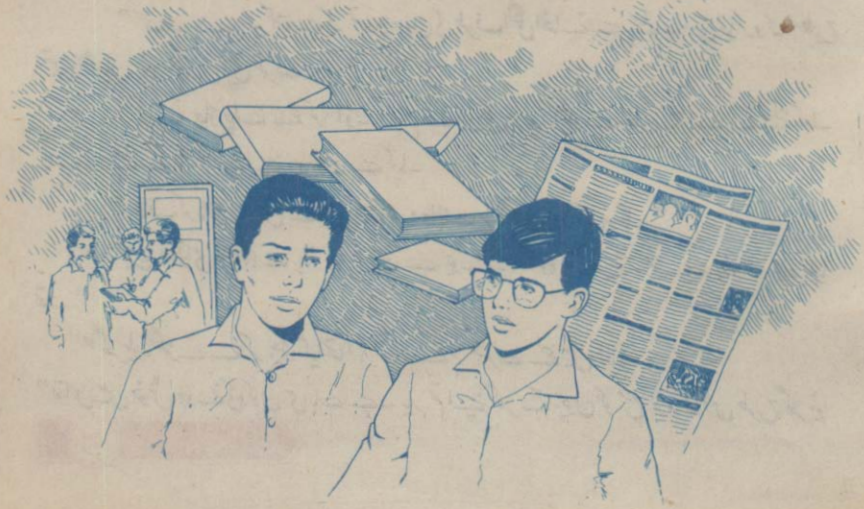

عموماً ہوتا یوں ہے کہ لوگ اپنے بڑوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں مگر ہماری بدنصیبی ہے کہ جدھر بھی جائیں عمیر کے بڑے بھائی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں ہماری شخصیت کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا ان کی شہرت کا ہے۔ وہ نہ صرف محلے میں بلکہ آس پاس کے محلوں میں بھی شیطان کی طرح مشہور ہیں۔

ہر چیز میں اختلافی پہلو تلاش کرنا ان کی عادت ہے اور ان کے ہر جملے کا آغاز عموماً "نہیں" سے ہوتا ہے۔ مثلاً کسی گرم ترین دن میں آپ ان سے کہیں،

"یار عمیر۔ آج بہت گرمی ہے۔" تو وہ فوراً جواب دیں گے۔ "نہیں کل اس سے زیادہ ہوگی۔"

ان کی گفتگو کا موضوع زیادہ تر بین الاقوامی معاملات ہوتے ہیں اس سے نچلی سطح کی گفتگو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ ہمارا ایک دوست ہمارے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں عمیر صاحب کا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔

"بھائی جان۔ آپ کا فون آیا ہے۔" وہ بولے۔

"اچھا تم ان کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی فون سن کے آتا ہوں۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ڈرتے ہوئے اس وجہ سے کہ ہمیں یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمارے دوست کے دماغ کی چولیں ہلا دیں گے۔ فون سننے کے بعد ہم کمرے میں واپس آئے تو عمیر کی آواز آرہی تھی۔

"کنفیوشس یہ کہتا ہے کہ تم دوسروں کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ اسطرح تین انگلیاں خود تمہاری اپنی طرف ہوتی ہیں۔"

"عمیر۔ جاؤ چائے لے کر آؤ۔" ہم نے ان کی مزید گفتگو سے جان چھڑانے کے لئے کہا۔

جب وہ چلے گئے تو ہم نے اپنے دوست سے کہا۔

"معاف کرنا یار۔ اس نے بین الاقوامی معاملات پر تمہیں بور کیا ہوگا۔"

"بین الاقوامی معاملات!" وہ حیرت سے بولے۔ "وہ تو گھریلو جھگڑے لے کر بیٹھ گیا تھا۔"

"گھریلو جھگڑے لے کر بیٹھ گیا تھا!؟" ہم نے پر مسرت لہجے میں کہا۔

"تو اس میں خوش ہونے کی کون سی بات ہے۔ یار تم اپنے گھر کے بچوں کو منع کرو کہ اس طرح گھریلو

جھگڑے دوسروں کے سامنے بیان نہ کیا کریں۔ تم تو الٹا خوش ہو رہے ہو۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے۔" ہم نے کہا۔ "ویسے کہہ کیا رہا تھا؟"

"کسی آمنہ اور اظہر بھائی جان کی لڑائی کا تذکرہ کر رہا تھا۔"

"آمنہ اور اظہر بھائی جان؟ یہ نام تو میرے لئے نئے ہیں۔ خیر وہ آتا ہے تو اس سے پوچھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں عمیر چائے لے کر اندر آ گئے۔ ہم نے ٹرے ایک طرف رکھوا کر نہایت خلوص سے انہیں گلے لگا لیا۔

"خیریت تو ہے بھائی جان؟" انہوں نے پوچھا۔

"مبارک ہو۔ تم نے گھریلو معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔"

"گھریلو معاملات میں دلچسپی؟ کیا مطلب!" وہ حیرت سے بولے۔

"ابھی تم نے میرے دوست سے آمنہ اور اظہر بھائی جان کی لڑائی کا تذکرہ نہیں کیا؟ ویسے بائی دا وے یہ آمنہ اور اظہر بھائی جان ہیں کون؟"

"آمنہ اور اظہر بھائی جان!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے اور پھر لاحول کہہ کر اتنی زور سے اچھلے کہ ہمیں ایک لمحے کے لئے نیوٹن کا کششِ ثقل کا نظریہ خطرے میں نظر آنے لگا۔ لیکن یہ خطرہ ان کی زمین پر بحفاظت "لینڈنگ" سے دور ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے ہاتھ سے اپنا سر پیٹتے رہے۔ پھر بولے،

"ارے میں آرمینیا اور آذربائیجان کی لڑائی کا تذکرہ کر رہا تھا۔"

"یہ کیا بلائیں ہیں؟" ہم حیرت سے بولے۔

"یہ بلائیں نہیں ہیں۔ روس کی دو ریاستیں ہیں۔ آرمینیا عیسائی ریاست ہے جبکہ آذربائیجان مسلم ریاست ہے۔"

یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے پلٹ گئے۔

ہمارے چہرے پر مایوسی طاری ہو گئی۔ ہم نے سر کو منفی انداز میں جنبش دی اور عمیر کو کمرے سے نکلتا دیکھتے رہے۔

□

امتحانات قریب تھے۔ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے تیاری کر رہے تھے۔ اتنے میں عمیر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ ہم "آل تو جلال تو" کا ورد شروع کرتے، وہ ہم سے پوچھ

بیٹھے،

"بھائی جان کیا پڑھ رہے ہیں؟"

"ریاضی پڑھ رہا ہوں۔"

"ریاضی بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ریاضی کسی سیاہ تاریک کمرے میں ایک ایسی سیاہ بلی کی تلاش کا نام ہے جس کا سرے سے کوئی وجود نہ ہو۔ بالکل فضول سبجیکٹ ہے۔"

"کیوں فضول کیوں ہے؟" سوچا تو یہ تھا کہ بحث بالکل نہیں کریں گے مگر ضرب ہمارے پسندیدہ مضمون پر پڑ رہی تھی لہٰذا صبر نہ ہو سکا۔ "دیکھئے۔ فرض کیجئے ایک آدمی ہے۔ اس کا ایک پاؤں آگ میں اور ایک برف میں ہے۔ اب ریاضی کے قانون کے تحت وہ اوسطاً آرام سے ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً ایسا ہی ہے؟"

"احمق آدمی۔ یہاں پر ریاضی کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔"

"تو ایسا سبجیکٹ پڑھنا فضول ہی ہے جس کا اطلاق محدود ہو۔"

ہم غصے میں انہیں گھور کر رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک خموشی رہی مگر ان سے زیادہ دیر صبر نہ ہو سکا۔

"بھائی جان! آپ تو ریاضی کے ایکسپرٹ ہیں۔ ایک آسان سا سوال ہے پوچھوں، ناراض تو نہ ہوں گے؟"

"پوچھو۔"

"تین دوست ہیں۔ وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ بل تیس روپے بنتا ہے۔ تینوں اپنی جیب سے دس دس روپے نکال کر دیتے ہیں۔ وہ جانے ہی والے ہوتے ہیں کہ بیرا دوڑا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ غلطی سے تیس روپے بل بنا دیا گیا تھا حقیقتاً بل پچیس روپے کا تھا۔ وہ دو روپے بیرے کو ٹپ دیتے ہیں اور ایک ایک روپیہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ہر ایک دوست کے لئے کھانے کی لاگت نو روپے پڑی۔ نوتیاں ستائیس۔ دو روپے بیرے کے پاس۔ ستائیس اور دو انتیس۔ ایک روپیا کدھر گیا؟"

اس سوال نے ہمیں سر کھجانے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جھنجھلا کر بولے۔

"ایسے احمقانہ سوالات تم سیکھ کر کہاں سے آتے ہو؟"

"جواب نہ آیا تو سوال احمقانہ ہو گیا۔ خیر یہ کوئی نئی بات نہیں، تاریخ میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ دنیا نے سدا سمجھا فرزانے کو دیوانہ۔"

"جاتا ہوں، جاتا ہوں۔ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟" وہ اٹھ گئے اور دروازے کے قریب پھر مڑ کر بولے۔

"چلیں۔ جاتے جاتے صرف اتنا بتا دیں کہ صفر کو صفر سے تقسیم کرنے پر کیا حاصل ہوتا ہے؟"

ہم اٹھ کر انہیں مارنے دوڑے اور وہ، یہ جا وہ جا۔ کمرے کی چٹخنی چڑھا کر ہم بستر پہ گر کر ہانپنے لگے۔

.....○○○.....

امتحانات سے فارغ ہوئے ایک عرصہ ہوچکا تھا۔ اب ہمیں اپنے نتائج کا انتظار تھا۔ اپنے کمرے میں جاسوسی ناول سے دل بہلا، بلکہ دل دہلا رہے تھے کہ کال بیل کی آواز آئی۔

باہر نکل کر دیکھا تو دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں قلم اور نوٹ بک تھی اور دوسرا کیمرا لئے کھڑا تھا۔ انہوں نے ہمارا نام سوالیہ انداز میں لیا۔

"جی ہاں! میں ہی ہوں۔"

"ہم ایک مقامی روزنامے کی طرف سے آئے ہیں۔"

"اوہو! آیئے نا، اندر آکر بیٹھیے۔"

ان کو ہم نے ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھا دیا۔ دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ خدایا کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟ کہیں ہماری پوزیشن تو نہیں آئی؟ مگر کیسے؟ فرسٹ ایئر میں تو اتنے نمبر نہیں تھے۔ لیکن اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے پوزیشن کی کوئی سبیل پیدا کردی ہو۔ بہرحال تھوڑی دیر میں ہمیں یہ یقین ہوچکا تھا کہ ہماری پوزیشن آئی ہے اور یہ لوگ ہمارا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھیے۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

ہم ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آئے۔ کپڑوں کی الماری سے بہترین کپڑے نکال کر ان پر استری کی، کپڑے تبدیل کئے۔ اس دوران ذہن مستقل یہ سوچنے میں لگا ہوا تھا کہ ان کو انٹرویو کیا دینا ہے۔

سب سے پہلے تو ملک کے تعلیمی نظام پر تنقید کرنی ہے۔ بھلا یہ کوئی تعلیمی نظام ہے کہ جس نے رٹ لیا، اس کے نمبر زیادہ آگئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ہم بھی تو اسی نظام تعلیم کے تحت پوزیشن

لے کر آئے ہیں۔ لہٰذا یہ آئیڈیا ڈراپ۔ ہاں! کلاشن کوف کلچر کے خلاف بات زوردار رہے گی۔ طلبہ میں بدامنی کا ذمہ دار سیاست دانوں کو قرار دیں گے۔ جی ہاں بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ سال میں آٹھ مہینے کالج بند رہتے ہیں۔ طلبہ کا کتنا نقصان ہوتا ہے۔

کون سے ٹیچر کی زیادہ تعریف مناسب رہے گی؟ نسیم صاحب کی تعریف؟ لیکن انہوں نے اس روز پوری کلاس کے سامنے کس بری طرح ذلیل کیا تھا مجھے۔ نہیں نسیم صاحب کی تعریف تو بالکل نہیں کرنی۔ ہاں شکیل صاحب کی تعریف بالکل مناسب رہے گی۔ یہی سوچتے ہوئے ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"سب سے پہلے تو اپنی اوّل پوزیشن پر مبارکباد قبول کیجئے۔" جس کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی، وہ بولا۔

"شکریہ ....." اوّل پوزیشن کا نام سنتے ہی ہمارے جسم میں ایک کلو خون بڑھ گیا۔ خدایا! تو کتنا غفور الرحیم ہے۔ جب بھی دیتا ہے، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

"آپ ہمیں اپنے معمولات کے متعلق کچھ بتائیں گے؟"

"جی ہاں۔ میں روزانہ پانچ گھنٹے پڑھتا ہوں۔" ہم نے سفید جھوٹ بولا۔

"ضرور پڑھتے ہوں گے۔ آپ کا انداز تحریر بتاتا ہے۔"

"کیا مطلب .....؟ آپ نے بورڈ میں جاکر ہماری کاپیاں بھی دیکھی ہیں؟"

"بورڈ؟ کاپیاں .....؟" وہ حیرت سے بولا۔ "میرا خیال ہے آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔ ہمارے اخبار نے جو مقابلۂ مضمون نگاری کرایا تھا، آپ نے اس میں اوّل انعام حاصل کیا ہے۔"

"میں نے؟" ہم حیرت سے بولے۔

"جی ہاں! آپ نے۔"

"کیا موضوع تھا؟"

"آپ تو مذاق پر اتر آئے۔ موضوع ظاہر ہے وہی تھا جو آپ نے لکھا۔ یعنی "کمیونزم کی پسپائی اور وسط ایشیا کے مسلمان"۔"

"ہیں!!" ہم حیرت سے اچھل پڑے۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"کیا کمیونزم پسپا ہوگیا؟"

اب دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

"آپ تو بالکل ہی مذاق پر اترے ہوئے ہیں۔" نوٹ بک والا بولا۔

"دیکھئے آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم نے ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا۔"

"کیا آپ کا نام اور پتا یہ نہیں ہے؟" انہوں نے ہمارا نام اور پتا دہراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ بالکل یہی ہے لیکن یہ مضمون ہم نے نہیں لکھا۔"

دونوں حضرات کے منہ بن گئے۔ قریب تھا کہ وہ اٹھ کر جاتے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"ارے بھائی جان۔ مانا کہ آپ منکسرالمزاج ہیں مگر اب ایسی بھی کیا کسرِ نفسی؟ کتنی محنت کی ہے آپ نے یہ مضمون لکھنے میں۔ رات رات بھر جاگے ہیں۔ لائبریریوں کے چکر لگائے ہیں۔" یہ عمیر کی آواز تھی۔ پھر وہ صحافیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے،

"آپ بُرا نہ مانئے گا۔ بھائی جان بچپن سے کسرِ نفسی کے عادی ہیں۔ میرے سامنے انہوں نے مضمون آپ کو پوسٹ کیا تھا۔ بھائی جان اب تو سچ بتا دیں۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"جی ہاں۔ ہم نے ہی تو لکھا تھا۔ اور کیا!" ہم تھوک نگلتے ہوئے بولے۔ پھر ہماری تصویریں کھنچیں۔ چائے وغیرہ پی کر وہ رخصت ہوئے تو ہم عمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔

"عمیر کے بچے۔ یہ کیا حرکت تھی؟"

"بھائی جان۔ وہ مضمون دراصل میں نے لکھا تھا۔"

"تم نے؟"

"جی ہاں۔ دراصل مقابلہ کی تین درجہ بندیاں تھیں۔ ایک موضوع اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کے لئے تھا اور ایک اٹھارہ سے تیس اور ایک تیس سے اوپر۔ اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کے لئے بالکل بچکانہ موضوع تھا۔ لہٰذا میں نے آپ کے نام سے اٹھارہ سے تیس سال تک کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔"

ہم نے ان کے کان کھینچنے کیلئے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ وہ بولے۔

"مگر بھائی جان۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ آپ کی تو مفت کی شہرت ہوئی ہے۔"

ہمارا بڑھتا ہوا ہاتھ بیچ میں ہی رک گیا۔

تو اے قارئین کرام۔ اب آپ ہی مشورہ دیجئے کہ ہمیں عمیر کے کان کھینچنے چاہئیں، نہیں؟"

بے حقیقت کچھ

عقیل عباس جعفری

مغالطہ :۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

حقیقت :۔

مشہور محقق قاضی عبدالودود اپنے مقالے آوارہ گرد اشعار میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ کلیات سودا کے بعض ایڈیشنوں میں یہ شعر ملتا ہے مگر کلیات سودا کے معتبر نسخے اس شعر سے خالی ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن، گلزار ابراہیم اور تذکرہ مسرت افزا کے مطابق یہ شعر فتح علی شیدا کا ہے۔ جو مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے۔

(حوالہ نقوش لاہور شمارہ ۵۸۔ ۵۷ صفحہ ۷۷۔ (۱۷۶

مغالطہ :۔

الّو دن میں نہیں دیکھ سکتا۔

حقیقت :۔

اگر یہ کہا جائے کہ الّو مکمل تاریکی میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تو یقیناً درست ہو گا مگر یہ کہنا کہ الّو دن کے اُجالے میں اندھا ہو جاتا ہے اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا، کلی طور پر درست نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ الّو نیم تاریکی میں یا کم روشنی میں انسانوں سے کہیں بہتر طور پر دیکھنے پر قادر ہوتا ہے۔ اسی لئے بہت سے الّو رات کے وقت شکار پر نکلتے ہیں۔ الّو مختلف رنگوں میں تمیز بھی کر لیتے ہیں اور انہیں یہ صلاحیت بھی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی گردن ۱۸۰ درجے کے زاویئے تک گھما لیتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر اپنی پشت کی طرف بھی دیکھ سکتے ہیں۔

حوالے :۔

(Ref. Fact and fallacies by Rhoda and Leda Blumberg. P.30)

مغالطہ :۔

بھاپ کا انجن، جیمز واٹ کی ایجاد ہے۔

حقیقت :۔

دنیا کا پہلا کامیاب بھاپ کا انجن ۱۶۹۸ء میں انگلستان کے ٹامس سیوری (THOMAS SA-VERY) نے بنایا تھا اور اسی برس ۲۵ جولائی کو اپنی یہ ایجاد پیٹنٹ بھی کروالی تھی۔

تاہم پسٹن سے چلنے والا ایک نسبتاً زیادہ بہتر بھاپ کا انجن انگلستان کے ہی ٹامس نیو کومن (THOMAS NEWCOMEN) نے ۱۷۱۲ء میں بنایا تھا۔

جیمز واٹ اس ایجاد کے کوئی ۲۴ برس بعد ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں جب وہ گلاسگو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، اسے اسٹیم انجن کو مزید بہتر بنانے کا کام سونپا گیا۔ جیمز واٹ نے نیو کومن کے ایجاد کردہ بھاپ کے انجن میں ایک کنڈنسر کا اضافہ کیا۔ جس سے نہ صرف اس انجن کی فعالیت میں خاصہ اضافہ ہو گیا بلکہ کوئلے کا خرچہ بھی کم ہو گیا۔

جیمز واٹ نے اپنا یہ انجن ۱۷۷۷ء میں تیار کیا تھا۔ اس وقت انگلستان میں نیو کومن کے ۷۵ بھاپ کے انجن زیر استعمال تھے۔

حوالے :۔

(Ref. The Inventions that Changed the World. Edited by Garden Rattray Taylor, P. 276-277)

مغالطہ :۔

دوربین، گلیلیو گلیلی کی ایجاد ہے۔

حقیقت :۔

یہ درست ہے کہ گلیلیو گلیلی پہلا شخص تھا، جس نے دوربین کے ذریعہ آسمانوں کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا۔ مگر وہ دوربین کا موجد نہیں۔

دوربین ۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک سائنسدان ہانس لیپریشے نے ایجاد کی تھی۔ اور اسی برس اس نے اپنی یہ ایجاد پیٹنٹ بھی کروالی تھی۔ لیپریشے نے اپنی ایجاد کا پہلا عوامی مظاہرہ ۲ اکتوبر ۱۶۰۸ء کو کیا تھا۔

گلیلیو گلیلی کو اس ایجاد کے متعلق علم ہوا تو اگلے برس اس نے لیپریشے ہی کے اصول پر، خود بھی ایک دوربین بنا ڈالی۔ اور اسے آسمان کے مشاہدے کے لئے استعمال کیا۔ اسی ایجاد کے باعث اس نے اعلان کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے اور زمین کے علاوہ دوسرے سیارے بھی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔

حوالے :۔

(Ref. The Inventions that Changed the World. Edited by Garden Rattray Taylor, P. 284)

مغالطہ :۔

Save Our Souls S.O.S کا مخفف ہے۔

حقیقت :۔

خطرے کے وقت بحری جہاز ایس او ایس کا سگنل دیتے ہیں۔ جس کے بارے میں بالعموم

لوگوں کا خیال ہے کہ یہ Save Our Souls کا یا Save Our Ship کا یا Send Our Soccer کا مخفف ہے۔ مگر در حقیقت یہ کسی کا بھی مخفف نہیں ہے۔ یہ سگنل ۱۹۰۶ء میں ایک ریڈیو ٹیلیگراف کانفرنس میں تجویز کیا گیا تھا اور ۱۹۰۸ء میں اسے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس سگنل کو تسلیم کرنے کا سبب یہ تھا کہ اس سگنل کی ترسیل اور وصولیابی دونوں بہت آسان ہیں۔

مورس کوڈ میں ایس کے تین نقطے اور او کے لئے تین ڈیش استعمال کئے جاتے ہیں چنانچہ ایس او ایس کسی بھی پیغام کا مخفف نہیں ہے بلکہ فقط تین حروف پر مشتمل ایک ایسا پیغام ہے جو بحری جہاز خطرے میں گھر جانے کے باعث کسی دوسرے جہاز کو ارسال کرتے ہیں۔

حوالے :۔

(Ref. Don't You Believe It by Graham and Sylvana Nown, P. 36)

(Ref. The Dictionary of Misinformation by Tom Burnam, P. 265)

مغالطہ :۔

کوئی پرندہ پیچھے کی سمت اڑنے پر قادر نہیں ہوتا۔

حقیقت :۔

عام طور پر مشاہدے میں یہی آتا ہے کہ تمام پرندے جب اڑتے ہیں تو وہ آگے کی سمت ہی سفر کرتے ہیں۔ مگر ایک پرندہ ایسا بھی ہے جو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر، نیچے ہر سمت اڑنے پر قادر ہوتا ہے یہ پرندہ جنوبی امریکہ میں پایا جاتا ہے اور اس کا نام ہے "ہمنگ برڈ۔"

ہمنگ برڈ کئی اور خوبیوں کے باعث بھی خاصا مشہور ہے۔ مثلاً یہ دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ہے اس پرندے کا انڈا، پرندوں کے انڈوں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے جس کا وزن صفر اعشاریہ ۵ گرام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پرندہ اپنے پروں کو ۹۰ مرتبہ فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت دے سکتا ہے۔ اور یوں اس کے پروں کی رفتار دنیا بھر کے پرندوں میں سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

حوالے :۔

(Ref. Don't You Believe It by Gyles Brandreth, P. 24)

(Ref. Bananas Don't Grow on Trees by Joseph Rosenbloom, P. 41)

مغالطہ :۔

تمام شارک مچھلیاں آدم خور ہوتی ہیں۔

حقیقت :۔

دنیا میں شارک مچھلیوں کی تقریباً ۳۰۰ اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان ۳۰۰ اقسام میں سے فقط چند اقسام آدم خور ہوتی ہیں جن میں گریٹ وہائٹ شارک، ٹائیگر شارک، بلیو شارک اور ہیمر ہیڈ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

(Ref. Facts and Fallacies by Rhoda & Leda Blumberg, P. 41)

انڈوں کا انتخاب

رمیصا سلیم

فرانس لینٹینگ ایک اچھا فوٹو گرافر ہے۔ اس کا مشاہدہ وسیع ہے اور اس کی نظر فوٹو گرافی کے لئے نت نئے موضوع تلاش کرتی رہتی ہے۔ دنیا کے اہم ترین مقامات گیلا پیگس، سرینیم اور زائر میں فوٹو گرافی کرتے ہوئے، جب اسے ساحلوں، شاہراہوں اور جنگلوں کا سفر در پیش ہوا تو اسے ان مقامات پر ٹوٹے ہوئے یا سالم انڈے اتنی بڑی مقدار میں نظر آئے کہ وہ بے اختیار اسے اپنی فوٹو گرافی کا موضوع بنا بیٹھا۔

طرح طرح کے انڈے، چھوٹے بڑے انڈے، رنگ برنگے انڈے اور انڈوں کے ٹوٹے ہوئے چھلکے اس کی متلاشی نظروں میں ایسے جچے کہ اس نے اسی موضوع کو اپنے لئے منتخب کر لیا۔ گزشتہ ماہ (فروری ۹۴ء) کے شمارے میں انڈوں کی جو حیرت ناک تصاویر آپ نے دیکھیں وہ بھی فرانس لینیٹنگ کی جستجو کا حاصل تھیں۔ زیرِ نظر مضمون میں بھی تمام تصاویر فرانس ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

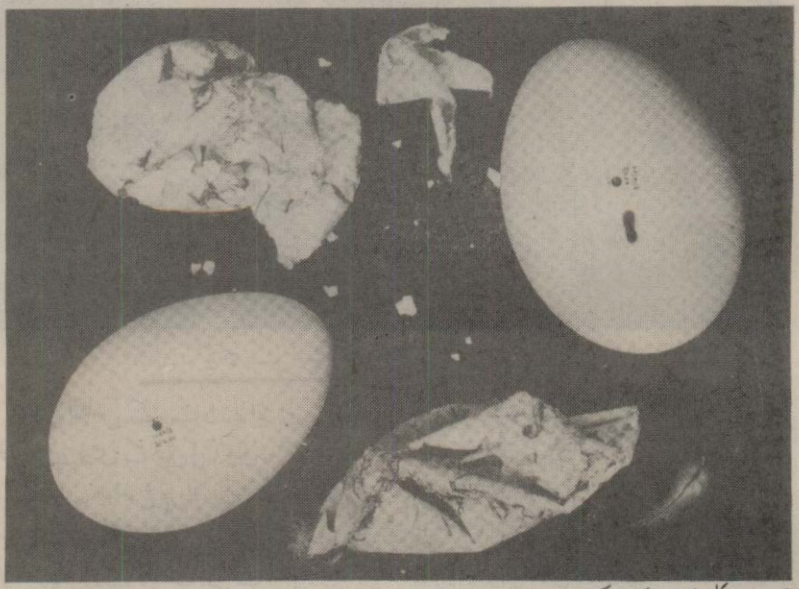

○..... پیلی کان کے تچکے ہوئے انڈے جنہیں کیڑے مار ادویات نے کمزور کر دیا تھا۔

○..... دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا انڈا۔

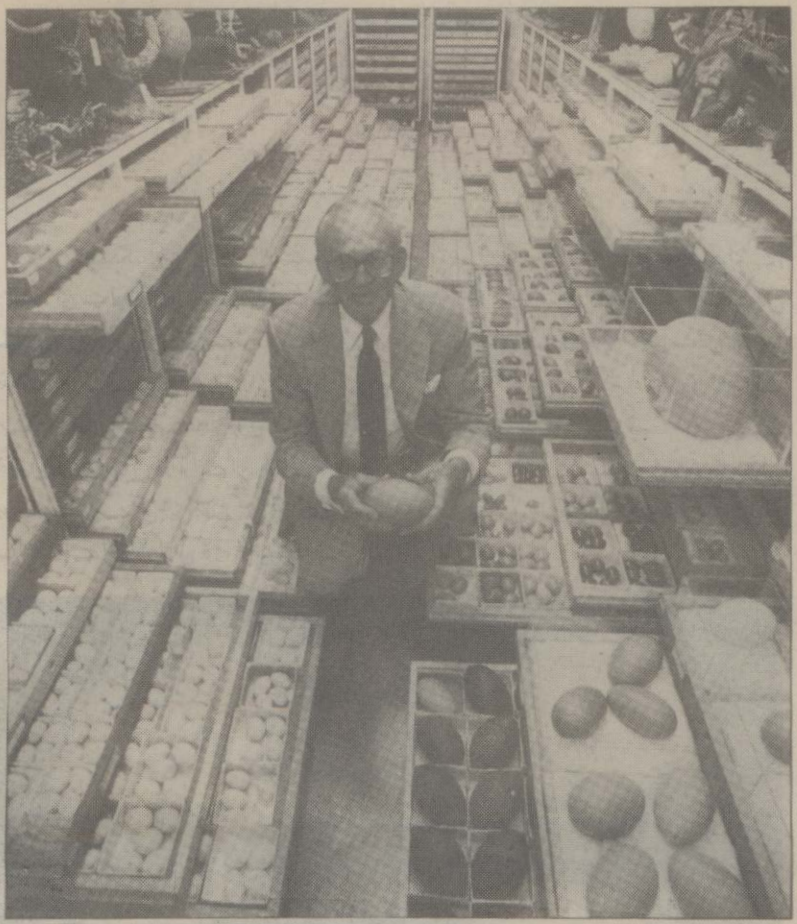

○ ..... ایڈ ہیریسن اپنے انتخاب لاجواب انڈوں کے ساتھ۔

لاس اینجلس کے رہنے والے ایڈ ہیریسن نے فرانس لینیٹنگ کے خیال کی تائید کی۔ "واقعی انڈے ایک لاجواب موضوع ہیں۔ دیکھنے کے لئے بھی اور سوچنے کے لئے بھی۔ انڈوں پر تحقیق غیر معمولی حقائق کو منظر عام پر لانے کا باعث ہوئی ہے۔ ہیریسن دنیا میں انڈوں کا سب سے بڑا ذخیرہ جمع کرنے والا واحد شخص ہے، جسے اپنے اس انتخاب پر بڑا ناز ہے۔ اس نے ۸ لاکھ سے زائد انواع و اقسام کے انڈے جمع کئے ہیں۔ جو اس وقت لاس اینجلس کے "ویسٹرن فاؤنڈیشن آف ورٹی بریٹ زولوجی" میں محفوظ ہیں۔ ۸ لاکھ انڈوں کی تلاش اور ان کی حفاظت واقعی علمی دنیا کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

گزشتہ ماہ دنیا کا جو سب سے بڑا انڈا ہم نے آپ کو آنکھ مچولی کے صفحات میں دکھایا تھا اس کے بارے میں ہیریسن کہتے ہیں کہ یہ انڈا شتر مرغ سے ملتے جلتے ایسے پرندے کا ہے جس کا قد ۱۲ فٹ اونچا اور جس کا وزن ایک ٹن سے زیادہ تھا اس پرندے کو وہ Elephant bird کہتا ہے۔ گو یہ پرندہ دنیا سے ختم ہو چکا ہے مگر خوش قسمتی سے اس کا یہ انڈہ مڈغاسکر کے ساحلوں پر کسی طرح محفوظ رہا۔ دنیا کے سب سے بڑے انڈے کو جس چھوٹے سے انڈے کے ساتھ رکھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ وہ انڈا ہمنگ برڈ کا تھا۔

ہیریسن نے انڈوں کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ کوئل اپنا انڈا کسی ایسے پرندے کے گھونسلے میں دیتی ہے جس کے اپنے انڈے، سائز، رنگ اور شباہت میں کوئل کے انڈوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اس طرح کوئی اور پرندہ کوئل کے انڈوں کو اپنا انڈا سمجھ کر ان پر بیٹھتا ہے اور بچے نکالنے کا باعث بنتا ہے۔ اس میں دلچسپی اور حیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جیسے ہی کوئل کے انڈے سے بچہ نکل آتا ہے کوئل یا تو دوسرے انڈے ضائع کر دیتی ہے یا پھر دوسرے بچوں کو گھونسلے سے گرا دیتی ہے۔

ہیریسن کی تحقیق نے ایک اور بات یہ بھی ثابت کی کہ جب کھیتوں یا جنگلوں میں ڈی ڈی ٹی (جراثیم کش یا کیڑے مار دوا) چھڑکی جاتی ہے تو اس دوا سے بھی انڈوں کا خول کمزور پڑ جاتا ہے، پھر جیسے ہی پرندہ انڈوں پر بیٹھتا ہے، انڈے فوراً ٹوٹ جاتے ہیں۔ اپنی تحقیق کی شہادت کے لئے ہیریسن پیلی کان کے انڈوں کو پیش کرتا ہے۔ جو محض، کیڑے مار دواؤں کی وجہ سے کمزور ہوئے اور ٹوٹ گئے۔

انڈوں کے رنگ، ان کی بناوٹ چھلکے کی ساخت اور ان کے جسم وغیرہ سے بہت سے نتیجے اخذ کئے گئے ہیں۔ بہت سے انڈے دنیا سے ختم ہو جانے والے پرندوں کی نشاندھی بھی کرتے ہیں۔

پرندوں اور جانوروں کی نسل کے ارتقاء اور اختتام کے بارے میں ہونے والی تحقیق میں انڈوں نے محققین کی بہت مدد کی ہے۔

مصوروں نے انڈوں کو تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کے چھلکوں پر حسین نقش بنائے ہیں، اسے تخلیق اور فن کا شاہکار نمونہ بنا دیا ہے۔

جن ملکوں میں تحقیق کی راہیں کھلی ہوئے ہیں، وہاں انڈوں نے علم کے نئے نئے در کھولے ہیں ایک ہم ہیں کہ ابھی تک انڈوں سے صرف آملیٹ اور ہاف فرائی کے علاوہ کچھ اور نہیں بنا سکے۔

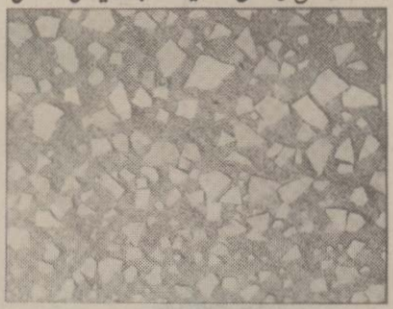

○ ..... ساحل پر پڑے ہوئے انڈوں کے چھلکے جو تحقیق اور تخلیق کا موضوع بن گئے۔

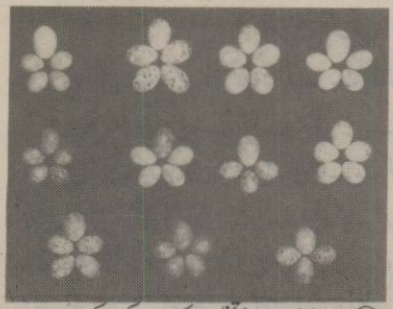

○ ..... انڈوں نے تخلیق کئے ہیں کیسے کیسے پھول۔

گُلگُلے

انعامی لطیفہ

ایڈورڈ ڈناٹے ایک بہت دلچسپ شخص تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے شاعر دوست جیمز وہاٹ کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا کہ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے کے لئے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو ایڈورڈ نے جیمز سے کہا "غضب ہو گیا! میں نے تمہارا ٹکٹ تو خریدا ہی نہیں اب جلدی سے سیٹ کے نیچے گھس جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے۔" جیمز گھبرا اٹھا اور سیٹ کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کرتا ہوا ایڈورڈ کے پاس آیا تو اس نے اس کے ہاتھ میں دو ٹکٹ تھما دیئے۔

"یہ دوسرا ٹکٹ کس کا ہے؟" ٹکٹ چیکر نے پوچھا تو ایڈورڈ نے سیٹ کے نیچے چھپے ہوئے جیمز کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ دوسرا ٹکٹ میرے دوست کا ہے۔ یہ بے وقوف ہمیشہ اسی طرح سفر کرتے ہیں۔"

ہشام آفتاب (دبی)

استانی۔ اگر ہم ایک ٹماٹر لے کر اس کے دو ٹکڑے کریں۔ پھر دو کے دو کریں اور پھر ان کے دو دو کریں، تو کیا بن جائے گا؟

چھوٹی لڑکی۔ ٹماٹر کی چٹنی۔

محمد اشرف، گھانچی

بِن کھلے مُرجھا گئے۔

چار افیمی بینک لوٹنے گئے۔ ایک نے کہا۔ "یار یہاں تو کوئی دیکھ لے گا اسے جنگل میں لے چلتے ہیں۔" چنانچہ چاروں نے بینک کی ایک ایک نکڑ پکڑ لی۔ ایک افیمی کی بیوی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے جوتا اتار کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ افیمی زور سے چلایا "یار آہستہ سے اٹھاؤ اوپر سے اینٹیں

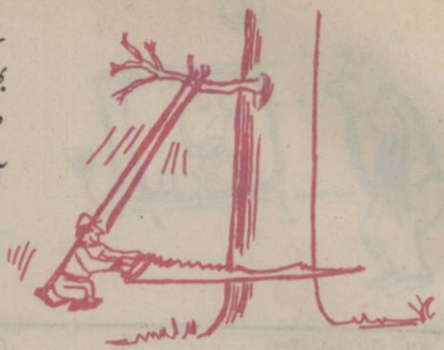

درخت کاٹنے کا صحیح طریقہ۔

گر رہی ہیں۔"

شازیہ عزیز، کراچی

بیٹی۔ امی کیا آپ اندھیرے میں لکھ سکتی ہیں؟

ماں۔ ہاں بیٹی۔

بیٹی۔ تو آپ میری رپورٹ کارڈ پر سائن کر دیں۔

حنا اقبال گوجرانوالہ

بیگم صاحبہ نے اپنی نئی ملازمہ سے پانی مانگا۔ بے چاری ملازمہ کی یہ پہلی نوکری تھی اور وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اس لئے جب وہ پانی لے کر آئی تو اس نے گلاس کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر بیگم صاحبہ نے ملازمہ کو سلیقہ سکھانے کی خاطر کہا۔ "دیکھو جب بھی کوئی چیز لاؤ ہمیشہ ٹرے میں رکھ کر لاؤ۔"

اگلی صبح ملازمہ بیگم صاحبہ کے کمرے میں آئی تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس نے ٹرے پکڑ رکھی تھی جو دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ آتے ہی اس نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ کیا میں چمچہ بھی لے کر آؤں یا آپ اسے یوں ہی چاٹ لیں گی؟"

حماد خالد فیاضی

محلہ جہانگیر آباد شیخوپورہ

باپ (بیٹے سے) بیٹا اسکول سے تمہاری شکایت آئی ہے۔

بیٹا۔ ابو کیسی شکایت، میں تو ایک ماہ سے اسکول نہیں گیا۔

محمد عابد سانگھڑ۔

ٹیچر۔ مردم خور کسے کہتے ہیں؟

طالب علم۔ معلوم نہیں مس۔

ٹیچر۔ اچھا اگر تم اپنے ماں باپ کو کھا جاؤ تو لوگ تمہیں کیا کہیں گے؟

طالب علم۔ یتیم کہیں گے مس۔

علی جبران۔ مخدوم پور پہوڑاں

ایک مالدار نوجوان سے ایک بھکاری نے کہا۔ "صاحب کیا بات ہے؟ دو سال پہلے آپ مجھے دس روپے دیا کرتے تھے، پچھلے سال پانچ روپے دینے لگے اور آج صرف ایک روپیہ دے رہے ہیں۔"

نوجوان بولا۔ "بھئی دو سال پہلے میں کنوارا تھا پچھلے سال میری شادی ہو گئی اور اب میں ایک بچے کا باپ ہوں"۔

بھکاری برہم ہو کر بولا "بہت خوب میرے

پیسوں سے آپ اپنے خاندان کی پرورش کر رہے ہیں۔"

ظہور راج۔ پسنی

ایک صاحب اپنی بیٹی کو لینے ہوائی اڈے پر گئے۔ جو لندن سے پانچ سال بعد وطن واپس آرہی تھی۔ وہ اسے گھر لا رہے تھے تو راستے میں پوچھا۔ "بیٹی لندن جانے سے پہلے تم مجھے پاپا کہتی تھیں مگر اب ڈیڈی کہتی ہو۔ کیا وجہ ہے؟"

بیٹی نے جواب دیا۔ "ڈیڈی۔ پاپا کہنے سے میری لپ اسٹک خراب ہو جاتی ہے۔"

خیال محمد، مینگورہ۔

کسی نے ایک سکھ سے کہا۔ "سردار جی! ہندوستان کے جھنڈے پر آپ کی کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ نارنجی رنگ ہندوؤں کا ہے۔ سفید عیسائیوں کا اور سبز مسلمانوں کا۔ سکھ نے کہا "وہ جو ڈنڈا ہے وہ کس کا نشان ہے؟"

جنید اختر، کراچی۔

ایک انگریز ہندوستان گیا۔ وہاں اس نے ایک سکھ سے پوچھا "جناب! کیا یہ راستہ شمال کو جاتا ہے۔ وہ انگریز صرف اردو جانتا تھا پنجابی کا ایک لفظ بھی اسے نہیں آتا تھا۔ سکھ نے کہا "آہو۔" (یعنی جی ہاں) انگریز نے دوسرے سے پوچھا اس نے بھی یہی کہا۔ ایک اور آدمی سے اس نے پوچھا تو وہ بولا "جی ہاں"۔ انگریز نے کہا کہ پہلے لوگ "آہو" کہتے تھے آپ "جی ہاں" کہہ رہے ہیں۔ اس نے کہا "پڑھے لکھے لوگ جی ہاں کہتے ہیں جبکہ ان پڑھ آہو کہتے ہیں۔" انگریز بولا "آپ بھی پڑھے لکھے ہیں؟"

آدمی بولا "آہو"

ظہیر انور۔ شیخوپورہ

ایک سیاسی لیڈر نے ایک رسالے کے ایڈیٹر کو فون کیا اور کہا "میں نے سنا ہے کہ تم نے مجھے اپنے رسالے میں جاہل اور بے وقوف لکھا ہے کیا یہ سچ ہے؟"

"نہیں جناب!" ایڈیٹر نے جواب دیا "یہ بات کسی اور نے اپنے رسالے میں لکھی ہوگی۔ میں وہ بات کبھی اپنے رسالے میں نہیں لکھتا جسے

میرے قارئین پہلے سے جانتے ہوں۔"

دو ہم شکل جڑواں بچے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا جبکہ دوسرا مسکین صورت بنائے بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" بچوں کے والد نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ابو۔" ہنسنے والے بچے نے جواب دیا۔

"امی نے آج دونوں مرتبہ احمد کو ہی غسل کرا دیا ہے۔"

ایک صاحب اپنی کار کے وہیل کیپ چرائے جانے پر بڑے پریشان تھے۔ آخر انہوں نے کار کے شیشے پر ایک چٹ لکھ کر لگا دی کہ "وہیل کیپ چرانے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔" جب وہ صاحب واپس آئے تو وہیل کیپ وہاں پڑے تھے اور کار غائب تھی۔

دو دوست شیخیاں مار رہے تھے۔ ایک نے کہا "میرے ماموں بہت بڑے آدمی تھے۔ بحر ہند انہوں نے ہی کھودا تھا اور اس سے جو مٹی نکلی تھی، اس سے انہوں نے کوہ ہمالیہ بنایا تھا۔"

دوسرے دوست نے کہا "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم نے بحرِ مُردار کا نام سنا ہو گا؟"

پہلا دوست بولا "ہاں سنا ہے۔"

"میرے ماموں نے ہی اسے مارا تھا۔" دوسرے دوست نے جواب دیا۔

توفیق سجاول۔ اسلام آباد

ایک فارم پر بندھے گھوڑے کو جو کوئی بھی آتا، کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور دے جاتا۔ اس ڈر سے کہ کہیں گھوڑا بیمار نہ ہو جائے، مالک نے ایک بورڈ لگوا دیا۔ جس پر لکھا تھا "برائے مہربانی گھوڑے کو کچھ نہ کھلائیں" ..... دستخط مالک۔

چند دنوں بعد وہاں ایک دوسرا بورڈ لگا ہوا تھا، جس پر لکھا تھا۔ "ساتھ والے بورڈ پر کوئی دھیان نہ دیں۔" ..... دستخط گھوڑا!۔

سیدہ کاشفہ خاتون نقوی۔ نارتھ کراچی

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

محمد حسین برادرز	کراچی ۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور — ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی — ۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد — ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور — ۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان — ۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد — ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ — ۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ
سلمان برادرز	نوابشاہ — ۲۴۱۴
سعید بک سٹال	گجرات — ۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بکسٹال	سرگودھا — ۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور — ۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان — ۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر
رحمت بکسٹال	اوکاڑہ
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ — ۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال

خط و کتابت کے لیے
ماہ نامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ - سائٹ • کراچی ۱۶

بارے کچھ کان کا بیان ہو جائے

عامر خورشید

کون ہے دوست، کون دشمن ہے
کان بھرنا بھی اک بڑا فن ہے

کچھ ہیں شوقین، پان کھاتے ہیں
کچھ ہیں ایسے جو کان کھاتے ہیں

رازداری کی یہ بھی ہے پہچان
نہ خبر ہو کسی کو کانوں کان

جو تھے جھوٹے وہ بن گئے سچے
لوگ ہیں کتنے کان کے کچے

پڑ نہ جائے کہیں بُری عادت
نہ سنو کان سے کوئی غیبت

نہ برائی کی کوئی بات سنو
صرف اچھائیوں پہ کان دھرو

بات جن کے نہ کان میں ٹھہرے
ان سے بہتر ہیں وہ جو ہیں بہرے

دن کی ہو کوئی بات یا شب کی
کان سنتے ہیں اپنے مطلب کی

ہے یقیناً وہی بھلا انسان
سنتے ہیں اچھی بات جس کے کان

ایاز محمود

درِ حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

محمد کاشف ...... سیٹلائٹ ٹاؤن بہاولپور
سوال ...... اگر زمین کے اندر کشش کی قوت موجود ہو تو جب ہم زمین پر ہی کسی کمرے کو ویکیوم کرتے ہیں تو اس وقت زمین کی چیزوں کو کھینچنے کی کشش کہاں جاتی ہے؟

○ ...... ڈراپر میں کسی مائع کا اس وقت تک نہ گرنا جب تک اس کو ہوا کا دباؤ مہیا نہ کیا جائے اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب ہوا کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اس وقت زمین کی کشش کہاں جاتی ہے؟

○ ...... جب ہم گیس والے غبارے کو ہوا میں چھوڑتے ہیں تو وہ اوپر کی طرف کیوں اٹھتا ہے، نیچے کیوں نہیں آتا ہے؟ یقیناً آپ کا یہاں جواب یہ ہو گا کہ غبارے کی گیس ہوا سے ہلکی ہے، چنانچہ اس جواب سے ثابت ہوتا ہے کہ کشش ثقل کے بجائے ہوا کے دباؤ کا عمل دخل زیادہ ہے۔

جواب ...... آپ کے نہایت طویل سوال کا مختصر جواب حاضر ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ زمین ہی نہیں بلکہ ہر مادی شے دوسری مادی شے کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور اس قوت کو تجاذب کہتے ہیں۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ ویکیوم (VACUUM) کی صورت میں بے وزنی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات اصولی اور عملی اعتبار سے غلط ہے۔

○ ...... ڈراپر سے مائع کا نہ گرنا ہوا کے دباؤ کا

مرہونِ منّت ہے۔ ڈراپر کے نچلے سرے پر ہوا کا دباؤ موجود ہوتا ہے جو پانی کے قطرے کو گرنے نہیں دیتا۔ اس کا توڑ کرنے کیلئے اوپر والے ربر کے حصہ کو دبا کر ہوا کا دباؤ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ عمل تجاذب کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔

○ ..... حقیقت یہ ہے کہ تجاذب کی وجہ ہی سے کائنات اور ہماری دنیا قائم و دائم ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ زمین اپنے محور پر لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔ گھومتے ہوئے لٹو کی سطح پر ریت کے دانے ڈال کر دیکھئے۔ دانے چاروں جانب بکھر جائیں گے۔ اگر تجاذب نہ ہوتی تو زمین پر گھومتے ہوئے لٹو پر ریت کے دانوں والا حشر ہوتا۔ نہ پانی ہوتا اور نہ فضا۔ ہمارا اور آپ کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے۔

خواجہ عرفان احمد ..... چکوال

سوال ..... ایک گلاس کو پانی سے لبالب بھر لیں اور اسے بہت احتیاط سے ایک میز پر رکھ دیں پھر ایک نمکدانی سے پانی پر نمک چھڑکتے جائیں اور دوسرے ہاتھ میں سوئیٹر بننے کی سلائی سے آہستہ آہستہ پانی کو ہلائیں تاکہ پانی باہر نہ گرے۔ فرض کیجئے اس طرح آپ نے نمک دانی سے ایک چھٹانک نمک پانی میں چھڑک دیا تو آپ دیکھیں گے کہ سارا نمک پانی میں چلا گیا مگر پانی کی سطح ذرا بھی بلند نہیں ہوئی اور ایک قطرہ پانی بھی گلاس سے نہیں گرا۔ آخر نمک کہاں گیا؟ اس کے برعکس اگر کوئی اور شے پانی میں ڈالیں تو پانی چھلک جائے گا۔

جواب ..... یہ بات تو بخوبی آپ کے علم میں ہوگی کہ کائنات کی تمام اشیاء سالموں یا مالی کیولز سے مل کر بنی ہیں۔ آپ نے پانی میں نمک حل ہونے کی بات پوچھی ہے تو بھائی اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ سالمے، جن سے مل کر پانی بنا ہے، کرہ یا گیند کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اب ایسے کسی ڈبے کا تصور کیجئے جس میں اوپر سے نیچے تک ٹیبل ٹینس کی گیندیں بھری ہوئی ہوں۔ بظاہر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ڈبہ بھرا ہوا ہے لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دو گیندوں کے درمیان واضح جگہ موجود ہے جس کی وجہ گیند کی مخصوص شکل ہے۔ پانی میں موجود سالموں کے ساتھ بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ یعنی درمیانی جگہ موجود ہوتی ہے جس کو نمک پُر کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نمک ایک خاص حد تک ہی پانی میں حل ہوسکتا ہے اور جب تمام خالی جگہیں پُر ہوجاتی ہیں تو مزید حل ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ آپ نے سوال کے ساتھ جوابی لفافہ بھیجا ہے۔ اگر ہم آپ کو براہ راست جواب دے دیں تو ممکن ہے آپ کا بھلا ہوجائے لیکن باقی دوسرے ساتھی اس سے محروم رہ جائیں گے۔ لہٰذا آئندہ تمام سوالات آنکھ مچولی کے توسط سے ہی بھیجئے۔ دیگر ساتھیوں سے بھی گزارش ہے کہ جوابی لفافہ بھیجنے سے احتراز کریں۔

عامر ممتاز طور ..... پنڈ دادن خان

سوال ..... بلیک ہولز کے بارے میں تفصیل سے تحریر کیجئے۔

جواب ..... ایک برطانوی سائنس دان کا کہنا ہے کہ

کائنات لامحدود حد تک حیرت انگیز نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ بلیک ہولز کائنات کے وہ پراسرار اندھے کنویں ہیں جنہوں نے عقل انسان کو حیران کر رکھا ہے۔ آج کل کے جدید دور میں بلیک ہولز کے تصور کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلیک ہولز کیا ہیں؟ تو برادرم اس کا تفصیلی جواب تو شاید ان صفحات میں نہ دیا جاسکے لیکن مختصراً پہلے چند بنیادی باتوں کو سمجھ لیجئے۔

۱۔ ستارے گیسوں کے بہت بڑے بڑے اجسام ہیں جو بہت زیادہ تپش کے ساتھ دہک رہے ہیں اور ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہے۔

۲۔ کائنات میں ہر شے دوسری شے کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کھینچنے کی قوت کو تجاذب کہتے ہیں۔ تجاذب کی قوت میں کمی یا بیشی کا تعلق اجسام کی کمیت (Mass) اور دو اجسام کے درمیانی فاصلے پر منحصر ہے۔ یعنی چھوٹے جسم کی تجاذب بڑے کے مقابلے میں کم ہوگی اور اجسام کے درمیان فاصلہ جتنا کم یا زیادہ ہوگا تجاذب بھی اسی حساب سے کم یا زیادہ ہوگی۔

اب ان ستاروں کی خبر لیں جو کروڑوں اربوں سال سے مستقل جلے جارہے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان ستاروں کی ایک طبعی زندگی ہوتی ہے جس کو پورا کرنے کے بعد یہ ختم ہوجاتے ہیں۔ اور ان کا خاتمہ ایک نہایت بڑے دھماکے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ستارے کا مرکزہ جو نہایت طاقتور قوت تجاذب کا حامل ہوتا ہے، ستارے کی اندرونی سطحوں کو نہایت تیزی سے کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے جیسے یہ فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے تجاذب بڑھتی جاتی ہے جو کہ آخر کار ایک لامحدود کثیف نقطے پر مرکوز ہوجاتی ہے۔ ایسے مقام کو بلیک ہول کہتے ہیں۔ یہاں قوت تجاذب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اس سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے سفر کیا جائے، جو ممکن نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود روشنی اس میں داخل ہوجائے تو نکل نہیں سکتی۔ لہٰذا انہیں نہ ہی دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ نہایت اعلیٰ قسم کے حساس سائنسی آلات ان کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

سارہ جبیں..... ایبٹ آباد

سوال..... زمین کا اختتام کہاں ہوتا ہے؟ اور زمین کے اختتام سے آگے یا نیچے کیا ہے؟ زمین ایک جگہ اٹکی ہوئی ہے اگر ہے تو یہ سورج کے گرد گردش کس طرح کرتی ہے؟

جواب..... کائنات، نظام شمسی اور زمین کے بارے میں ہم اکثر و بیشتر تفصیل سے بتاتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ رسالہ غور سے نہیں پڑھتیں۔

زمین، جیسا کہ سب کے علم میں ہے، گول ہے اور اپنے طور پر چکر کھانے کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی ایک خاص بیضوی مدار میں چکر لگا رہی ہے۔ اپنے محور پر گھومنے سے دن اور رات بنتے

ہیں۔ اور چونکہ زمین سورج کے حوالے سے اس کے ارد گرد چکر لگا رہی ہے تو اس عمل سے موسموں کی تبدیلی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سردیوں میں زمین سورج سے دور اور گرمیوں میں نسبتاً قریب ہوتی ہے۔ یہ نہایت غلط اور گمراہ کن بات ہے اور سائنسی اصولوں کے عین برخلاف۔ حقیقت یہ ہے کہ موسم سرما میں زمین نسبتاً سورج سے قریب ہوتی ہے لیکن سورج کی شعاعیں ہم تک ترچھی پہنچتی ہیں لہٰذا سردیوں والی کیفیت ہوتی ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ زمین کا کنارہ کہاں ہے؟ اس کا جواب ہم کیا دیں؟ یہ بتائیے کہ آپ نے گیند کا کوئی کنارہ محسوس کیا ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ یہ ہر طرف سے گول ہوتی ہے۔ یہی صورتحال زمین کے ساتھ ہے۔ ہم نے آپ کے سوال کا جواب خاصی تفصیل سے اس طرح دیا ہے کہ اس میں کئی ضمنی سوالات کے جوابات بھی آجائیں۔ قیصر عزیز...... ڈیرہ اسماعیل خان

سوال...... کس سائنس دان کی دریافت تھی کہ ہوا کے بغیر آگ بجھ جاتی ہے؟

جواب...... پرانے زمانے میں سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ دنیا کی ہر چیز میں ایک نظر نہ آنے والی شے ہوتی ہے جو اس چیز کے جلنے سے نکل جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے اس نظر نہ آنے والی شے کو ''فلوجسٹین'' کا نام دیا۔ بعد میں فرانس کے رہنے والے ایک سائنس دان لَوازے نے ثابت کر دیا کہ کسی بھی چیز کے جلنے کیلئے آکسیجن نامی گیس کی موجودگی ضروری ہے۔ آکسیجن چیزوں کو جلنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ گیس بے رنگ، بے مزا ہوتی ہے اور اسکی کوئی بو بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ہماری اور دیگر حیوانات کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ صغیر حسین بھٹو...... لاڑکانہ

سوال...... جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ گنجا نہیں ہوتا۔ مگر ایک عمر میں پہنچ کر وہ گنجا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجوہات اور علاج کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب...... گنجاپن دو اقسام کا ہوتا ہے۔ عارضی اور مستقل۔ عارضی گنجے پن کی وجوہات میں تیز بخار کا آنا، تپ دق، خوراک کی کمی اور جلدی بیماریاں وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں ایک سال کے اندر بال دوبارہ آجاتے ہیں۔ مستقل گنجاپن عموماً وراثت میں ملتا ہے۔ اس کا تعلق عمر کے بڑھنے اور ہارمونز کی کمی بیشی سے بھی ہے۔ یہ قطعی طور پر لاعلاج ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً چالیس فیصد سے زیادہ لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کا حملہ پورے سر پہ بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ صرف مردوں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کبھی بھی مکمل طور پر بالوں سے محروم نہیں ہوسکتیں۔ نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ بال گرنے کی صورت میں کسی قسم کا علاج، کوئی تیل یا کریم فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ نیم حکیموں اور بلند و بالا دعوے کرنے والے معالجوں سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ یہ لوگ دراصل ہماری ناواقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دُنیا کا سب سے لمبا آدمی

گزشتہ شمارے میں ہم نے دُنیا کے سب سے طویل القامت شخص کی تصویر شائع کی تھی۔ اس کے بارے میں چند مزید معلومات پیشِ خدمت ہیں۔
(ادارہ)

انتخاب و ترجمہ : خالد خلیل

محفوظ رکھی جانے والی انسانی تاریخ میں سب سے طویل القامت انسان ہونے کا اعزاز رابرٹ پرشنگ واڈلو کو حاصل ہے رابرٹ پرشنگ واڈلو ۲۲ فروری ۱۹۱۸ء کو آلٹن، امریکہ میں پیدا ہوئے۔

۲۷ جون ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر میک بریڈ اور ڈاکٹر چارلس جو کہ واشنگٹن یونیورسٹی میں اناٹومی کے پروفیسر تھے انہوں نے رابرٹ واڈلو کے قد کی پیائش کی تو ان کا قد ۲۷۲ سینٹی میٹر (۸ فٹ ۱ء ۱۱ انچ) تھا جبکہ دونوں بازوؤں کی لمبائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۲۸۸ سینٹی میٹر (۹ فٹ ۵۷۔۱۵ انچ) تھی۔

رابرٹ واڈلو کا موت سے ۱۸ دن پہلے مشی گن کے ایک ہوٹل میں وزن کیا گیا تو وہ ۱۹۹ کلو گرام نکلا اور قد نوفٹ کے لگ بھگ پہنچ چکا تھا۔

رابرٹ واڈلو اپنی ۲۱ ویں سالگرہ تک کئی ریکارڈ قائم کر چکا تھا اس کا وزن سالگرہ والے دن ۲۲۲ء۷ کلو گرام تھا جبکہ جوتوں کی لمبائی ساڑھے اٹھارہ انچ تھی ہاتھ کی لمبائی کلائی سے لیکر درمیانی انگلی کے سرے تک تقریباً ساڑھے بارہ انچ تھی۔

رابرٹ واڈلو نے اپنے آخری دن بیماری میں گزارے وہ اس دنیا سے ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء کو رخصت ہوا لیکن اپنا نام دنیا بھر کی ریکارڈ بک کی زینت بنا گیا۔

رابطہ

پہلا حصہ

عامر یوسف

ٹیلی فون کی گھنٹی نے امجد کو سوتے سے جگا دیا۔ لیکن اس کا دماغ فی الحال غنودگی میں تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بھی بھاری ہو رہے تھے۔ امجد نے کروٹ بدل کر دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ فون کی گھنٹی تو بجے جا رہی تھی۔ اور جب کئی منٹ تک فون کی گھنٹی بند نہ ہوئی تو امجد کی نیند کافور ہو گئی۔ اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھایا اور فون کا **ریسیور** اٹھا لیا۔

"ہاں بھئی کون ہے ......" امجد نے نہایت غصیلے لہجے میں کہا۔

لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ صرف ڈائل کی آواز آتی رہی۔ امجد نے ایک لمحے ریسیور کو گھورا جیسے سارا قصور ہی اس ریسیور کا ہو اور پھر کریڈل پر پٹخ دیا۔

لیکن امجد حیرت کے مارے ٹیلی فون کو ہی گھورتا رہا فون کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔

امجد نے لائٹ جلائی اور آنکھیں ملنے لگا۔ روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

اس نے ایک دفعہ پھر ٹیلی فون کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔

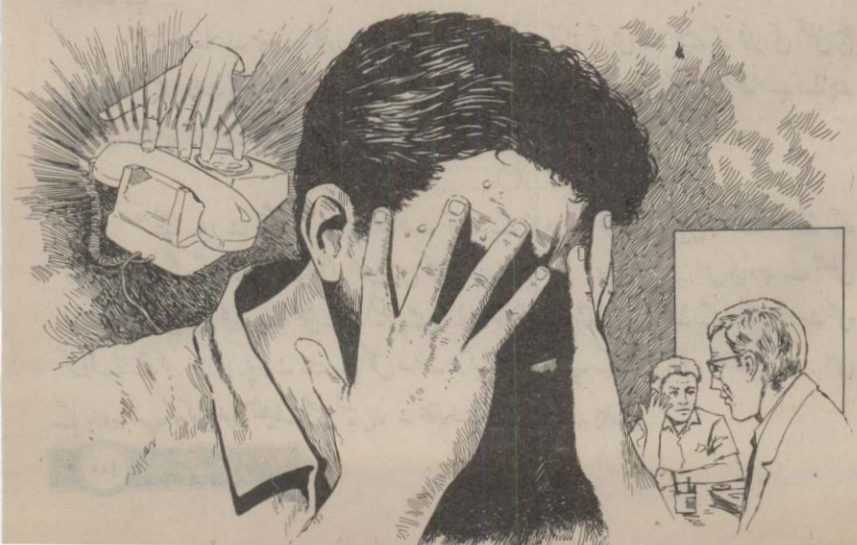

دوسری طرف ڈائل ٹون آرہی تھی لیکن امجد کی آنکھیں حیرت کے مارے ابل پڑیں۔ فون کی گھنٹی اس کے باوجود اس کو سنائی دے رہی تھی۔ امجد نے فون کا کھٹکا دبایا فون کی ڈائل ٹون تو بند ہوگئی لیکن فون کی گھنٹی بجنا بند نہ ہوئی۔

چند منٹ تک وہ یونہی ٹیلی فون کان سے لگائے کھڑا رہا۔ پھر اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ پسینے سے وہ شرابور ہو رہا تھا اور فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

تب ہی امجد کو احساس ہوا کہ فون کی وہ گھنٹی اس کے دماغ میں بج رہی تھی۔

.....○.....○.....

"ڈاکٹر صاحب..... میرے کان بج رہے ہیں....."

امجد نے ڈاکٹر کے کلینک میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"جی کیا فرمایا آپ نے....." ڈاکٹر صاحب نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میں نے کہا ہے کہ میرے کان بج رہے ہیں....." امجد نے رک رک کر کہا۔

"کیا سچ مچ..... آپ مذاق تو نہیں کر رہے....." ڈاکٹر صاحب نے بے یقینی سے پھر پوچھا۔

اب تو امجد کا موڈ بھی خراب ہوگیا۔ "ڈاکٹر صاحب میں مذاق بالکل نہیں کر رہا۔ اگر آپ میری مدد کر سکتے ہیں تو کیجئے میں آپ سے مذاق کرنے نہیں آیا ہوں۔"

"معاف کیجئے گا" ڈاکٹر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "آپ ذرا مجھے سمجھائیے کہ آپ کو کیا شکایت ہے....."

"ڈاکٹر صاحب میرے کانوں میں کل رات سے ایسی آواز آرہی ہے جیسے کہ فون کی گھنٹی بج رہی ہو..... میں رات بھر اس کی وجہ سے سو بھی نہیں سکا ہوں....." امجد بتانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے چند سوالات کئے اور پھر امجد کے کانوں کے معائنے میں مصروف ہوگئے۔

.....○.....○.....

"لیجئے رپورٹ آگئی..... امجد صاحب آپ کے کان تو بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے معائنے کے دوران ہی پتہ لگ گیا تھا۔ شک تھا کہ کان میں کہیں انفیکشن نہ ہوگیا ہو..... اس کی وجہ سے بعض اوقات اس طرح کی تکلیف ہو سکتی ہے۔ لیکن میں نے اپنا اور آپ کا شک دور کرنے کے لئے یہ ٹیسٹ بھی کروائے تھے اور ان کی رپورٹ سے یہ بالکل صاف ہوگیا ہے کہ آپ کے کان بالکل صحتمند ہیں..... اس کے علاوہ آپ کو کوئی اور تکلیف بھی نہیں۔ نہ بخار ہے اور نہ کوئی اور بیماری....."

ڈاکٹر اوصاف نے ایک گھنٹے بعد امجد کو دوبارہ بلا کر بتایا۔

"اچھا....." امجد خود حیران تھا..... "تو پھر یہ کیا ہے....."

"یہ بتایئے کہ فون کی گھنٹی اب تو محسوس نہیں ہو رہی....." ڈاکٹر اوصاف نے پوچھا۔

"نہیں..... فون کی گھنٹی ٹھیک صبح چار بجے بند ہوگئی تھی اس کے بعد سے اب تک تو نہیں آئی۔" امجد نے بتایا۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ گھر جا کر آرام کیجئے اور سو جایئے۔ اور اس شک کو اپنے دل سے نکال دیجئے کہ آپ کے کانوں میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔"

"اچھا..... لیکن آج کام کا کیا ہوگا....." "ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ....." امجد کلینک سے باہر آگیا۔

.....○.....○.....

"اف میرے خدا....." امجد بال نوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور پندرہ منٹ پہلے سے ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجنا شروع ہو چکی تھی۔

امجد نے فون کا ریسیور اٹھا کر پٹخا۔ لیکن بے سود۔ فون کی گھنٹی تو اس کے دماغ کے اندر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

امجد بستر پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی

.....

.....○.....○.....

"تو آپ سب کچھ آزما چکے ہیں....." ڈاکٹر شکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب..... میرے کان بالکل ٹھیک ہیں..... میں نے الٹرا ساؤنڈ تک کرا لیا ہے اس کی رپورٹ بھی یہی کہتی ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے..... کسی قسم کا کوئی مسئلہ میرے ساتھ نہیں ہے..... لیکن ڈاکٹر صاحب اس گھنٹی نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی ہے میں فیکٹری میں کام بھی ٹھیک نہیں کر پا رہا ہوں۔ سیٹھ صاحب روزانہ مجھے ڈانٹتے ہیں۔ میں کیا کروں ڈاکٹر صاحب....."

امجد کی حالت واقعی قابل رحم لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر شکیل کھڑکی کے باہر دیکھ رہے تھے۔ امجد ایک بستر پر لیٹا ہوا اپنی حالت بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر شکیل نفسیاتی ڈاکٹر تھے۔

"اچھا یہ فون کی گھنٹی صرف رات کو بجتی ہے....." انھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ بھی ڈھائی بجے کے بعد..... اور اس کے بعد سے میں سو نہیں پاتا ہوں..... بلکہ بستر پر

لیٹا ہوا بس اسی کا انتظار اور دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بس فون کی گھنٹی اب بجی کہ اب بجی ..... نیند تو آتی ہی نہیں ..... "

"ہوں ..... تمہیں یقین ہے کہ یہ ٹیلی فون کی گھنٹی ہی ہے ..... " ڈاکٹر شکیل نے پوچھا۔ ان کو اچانک ہی ایک خیال آیا تھا۔

"جی ہاں ..... سو فیصد یقین ہے ..... " امجد نے جواب دیا۔

"اور تمہارے دماغ میں ہی بجتی ہے ..... کیوں ..... "

"بالکل ڈاکٹر صاحب ..... "

"تو پھر امجد میاں ..... ایسا کرو کہ اگر اب وہ فون کی گھنٹی بجے تو آنکھیں بند کر کے یہ خیال کرو کہ جیسے تم دیکھ رہے ہو وہ فون بجتے ہوئے ..... اور پھر اس کا ریسیور اٹھاؤ خیال ہی خیال میں ..... پھر دیکھو کہ گھنٹی بند ہوتی ہے کہ نہیں ..... "

"جی ..... " امجد جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا .....

..... ○ ..... ○ .....

ڈاکٹر شکیل نے مشورہ انتہائی عجیب سا دیا تھا لیکن بستر میں لیٹتے ہوئے نہ جانے کیوں امجد کو احساس ہوا جیسے اس طرح اسے اس اندوہناک عذاب سے نجات مل سکے گی۔

امجد نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک ٹیلی فون کی خیالی تصویر اپنے دماغ میں بنانے لگا۔ پھر اس نے خیال ہی خیال میں اس ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ..... " امجد نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"خوش آمدید " آواز آئی اور اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی۔ لیکن جب دل نے دوبارہ دھڑکنا شروع کیا تو اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ فون کے ریسیور سے صاف آواز سنائی دی تھی انسانی آواز .....

"آرام سے دوست ..... " آواز دوبارہ آئی۔ یہ ایک مرد کی آواز تھی .....

"آرام سے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ..... " امجد کو آواز صاف سنائی دے رہی تھی ..... یہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔

"کیوں امجد میاں ..... ابھی تک فون پر موجود ہو نا ..... "

اور امجد کی سانس رک گئی۔

"تم کون ہو ..... اور یہ میرے دماغ میں کس طرح بول رہے ہو ..... اور تمہیں میرا نام کیسے پتا ہے

اور اور ...... اور یہ سب کچھ کیا ہے ......" اچانک امجد پھٹ پڑا۔
"اُفوہ ...... آرام سے بھائی ...... میں سب کچھ سمجھاتا ہوں ...... جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

"تو بتاؤ یہ سب کیا ہے ......" امجد نے پوچھا۔

"اچھا تو امجد سنو ...... یہ سب کچھ دراصل حکومت کا ایک خفیہ بلکہ انتہائی خفیہ منصوبہ ہے۔ تمہیں یہ بات صرف اپنے آپ تک ہی رکھنی ہے۔ کسی کو نہیں بتانی ہے سمجھے ......" آواز نے کہا۔

"کیا مطلب ......"

"مطلب یہ کہ ہماری حکومت نے جاسوسی کے نت نئے طریقے سوچنے کی غرض سے چند سائنس دانوں کو لگایا ہوا تھا۔ ہمیں آج کل کے حالات میں تمام پڑوسی ملکوں کی جاسوسی کرنا پڑتی ہے ...... اور یہ تمام کام بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال جاسوسی کرنے اور اطلاعات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے ہم نے یہ نئی ایجاد کی ہے جس کا تجربہ پہلی دفعہ تم پر کیا گیا ہے ...... تمہارے دماغ کا آپریشن کیا گیا تھا اور اس کے اندر ایک قسم کا بالکل ننھا منا سا ٹیلی فون لگا دیا گیا ہے۔ یہ ریسیور بالکل کسی ٹیلی فون کی طرح ہی کام کرتا ہے اور یوں دماغ سے دماغ تک پیغام پہنچ جاتا ہے ...... اس طرح کبھی بھی ہمارے جاسوس اور ان کے پیغام نہیں پکڑے جا سکیں گے ......" آواز نے سمجھایا امجد گنگ تھا جیسے اس کو سکتہ ہو گیا ہو۔

"میرے دماغ میں ......" امجد کے منہ سے نکلا۔

"ہاں ہمارے محکمے نے باقاعدہ لوگ منتخب کر کے ان پر تجربہ کیا ہے ...... تم سب سے پہلے آدمی ہو لیکن تمہارے علاوہ ابھی اور بھی بہت سارے ہیں ...... ان کے دماغ میں بھی ریسیور ہے لیکن ابھی تک ان سے کانٹیکیٹ نہیں ہو سکا ہے ...... بلکہ دراصل ابھی تک وہ تمہاری طرح فون کا ریسیور اٹھا نہیں سکے ہیں۔ ابھی تک وہ ڈاکٹروں کے چکر لگا رہے ہوں گے ...... تمہیں مبارک ہو کہ تم نے سوچ بچار کے بعد بالآخر بالکل صحیح قدم اٹھایا ہے ......"

آواز بول رہی تھی اور امجد سن رہا تھا لیکن ...... امجد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو ...... ہم نے تم سے پوچھا نہیں ...... ویری سوری لیکن اس میں ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ پھر امجد ...... یہ حکومت کا انتہائی خفیہ منصوبہ ہے ...... تمہیں یہ تمام واقعات اب کسی کو نہیں بتانے ہیں سمجھے ...... خیر ...... اب جبکہ تم سے رابطہ ہو ہی گیا ہے ...... ہم تمہیں اب

ڈسٹرب نہیں کریں گے ..... "

آواز نے کہا۔

"تو پھر کب تک ..... "

"سوری ..... یہ مجھے بھی معلوم نہیں اچھا اب آرام کرو ..... خدا حافظ ..... "

اور امجد نے اپنے دماغ کے اندر لائن کٹنے کی آواز سنی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

..... ○ ..... ○ .....

فون کی گھنٹی نے امجد کو جیسے جھنجھوڑ دیا۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کیں اور خیالی ٹیلی فون اٹھانے لگا۔

"ارے امجد ..... فون کیوں نہیں اٹھا رہے ..... " سیٹھ نے آکر غصے سے کہا اور امجد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ فیکٹری میں تھا اور سچ مچ کا ٹیلی فون بج رہا تھا۔

"سوری سر ..... " امجد نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"ہونہہ ..... سوری سر ..... پتہ نہیں پچھلے ہفتے سے تمہیں کیا ہو گیا ہے " ..... کام میں دل ہی نہیں لگتا ..... کام کیا کرو۔ تمہاری وجہ سے فیکٹری کی پروڈکشن پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ سیٹھ صاحب ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکل گئے اور امجد دھم سے اپنی کرسی پر گر پڑا۔ پچھلے پانچ دنوں سے کوئی فون کی گھنٹی اس کے دماغ میں نہیں بجی تھی اور وہ انتظار کی سی کیفیت میں ہر گھنٹی پر چونک اٹھتا تھا پھر امجد سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا.....

(جاری ہے)

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

پوشیدہ بین بنائیے

م۔الف۔راشد

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا "میں صرف دو سو روپے میں تمہیں ایک ایسی انوکھی شے لاکر دے سکتا ہوں جس کی مدد سے تم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہو۔ یعنی تم تو سب کو دیکھ سکتی ہو مگر کوئی دوسرا تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔"

بیوی نے خوشی خوشی دو سو روپے دے دیئے اور دن بھر اس عجیب و غریب جادوئی شے کا انتظار کرتی رہی۔ شام کو شوہر صاحب لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ بیوی نے جلدی سے وہ پیکٹ لیا اور بے صبری سے کھولا۔ اندر ایک سادہ سا برقعہ تھا۔ جس کی قیمت مشکل سے سو روپے ہوگی۔

لیکن ہم برقعے کے علاوہ بھی ایک ایسی چیز آپ کو بتا سکتے ہیں۔ جس کی مدد سے آپ خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے دیوار کی دوسری طرف کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے جنگ کے موضوع پر بنی ہوئی انگریزی فلموں میں آبدوزیں تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ اور اس بات کا مشاہدہ بھی کیا ہوگا کہ آب دوز کا کمانڈر زیر آب رہتے ہوئے، ایک موٹے سے پائپ کو پانی کی سطح سے تھوڑا سا بلند کر کے سطح سمندر پر موجود اشیاء کا نظارہ کر لیتا ہے۔ اس پائپ کو پیری اسکوپ یا پوشیدہ بین کہتے ہیں۔ ہم آپ کو ایک سادہ سی پوشیدہ بین بنانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔

سامان:۔

۱..... گتے کے دو چھوٹے ڈبے۔ (جیسے اولٹین کے ڈبے ہوتے ہیں)

۲..... آئینے کے دو چھوٹے ٹکڑے۔

۳..... چاقو یا قینچی۔

۴..... چپکنے والی ٹیپ۔

۲..... تصویر کے مطابق دونوں ڈبوں میں گول سوراخ نکالئے۔

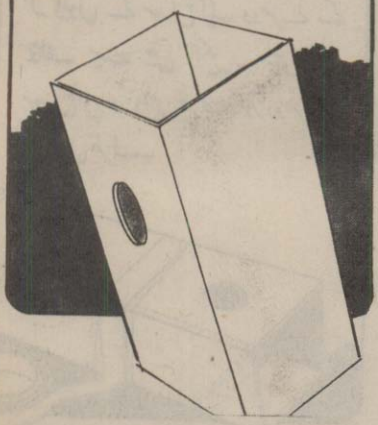

۳..... ڈبوں کے اندر آئینے کے ٹکڑوں کو ٹیپ کی مدد سے چپکا دیجئے۔ خیال رہے کہ آئینے کے ٹکڑے تقریباً ۴۵ درجے کے زاویئے پر ٹیپ کیجئے۔ جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔

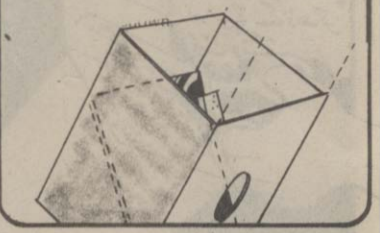

۴..... ایک ڈبے کو دوسرے میں پھنسا کر ٹیپ کی مدد سے چپکا دیجئے۔ اس طرح کہ ڈبوں کے سوراخ ایک دوسرے کے مخالف سمت میں آئیں۔ یعنی ایک سوراخ اوپر اور دائیں طرف، اور دوسرا نیچے اور بائیں طرف۔

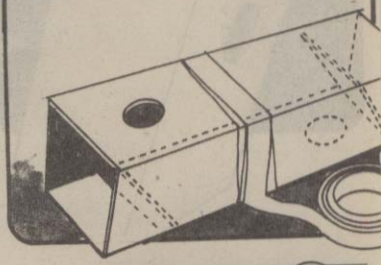

۵..... لیجئے پوشیدبین تیار ہے۔ تجربے کے لئے گھر کی دیوار کے اس پار دیکھنے کی کوشش کیجئے۔ اس طرح کہ ایک سوراخ دیوار کی بلندی سے تھوڑا سا اوپر ہو۔ پھر نیچے والے دوسرے سوراخ میں سے دیکھئے۔ آپ کو منظر صاف دکھائی دے گا۔

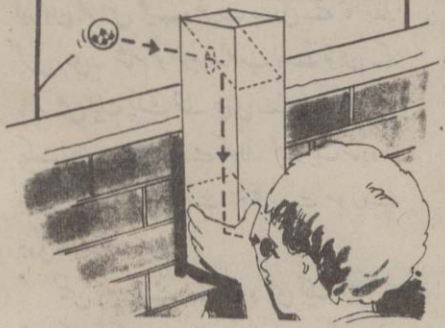

چونکہ روشنی خط مستقیم میں سفر کرتی ہے اور یہ آئینے کی سطح سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہے۔ اس طرح آپ خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے بھی دوسری طرف کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے تانک جھانک کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

شاہ نواز فاروقی

ایک عجیب روشنی

دنیا میں جانداروں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان جانداروں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی انسان اور حیوان۔ انسان اور حیوان کے درمیان بہت سے فرق پائے جاتے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے کی صلاحیت دی ہے اور حیوان کو نہیں۔

تاہم سوال یہ ہے کہ ایسی کون سی چیز ہے جو سب جانداروں میں مشترک ہے۔ اس کا جواب سائنس دانوں کے نزدیک ایک ہے۔ یعنی میدانِ حیات (Life field) یہ ذرا مشکل اصطلاح ہے چنانچہ آپ آسانی کے لئے اسے یوں سمجھئے کہ تمام جانداروں کے جسم کے اطراف میں ایک برقی رو موجود ہوتی ہے۔ اس برقی رو کو ایک خصوصی آلہ یعنی گلوانو میٹر کی مدد سے ناپا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے ضروری ہو گا کہ آپ گلوانو میٹر کو اس جاندار کے قریب یا اس کے جسم سے چسپاں کر دیں۔ یہ جاندار انسان بھی ہو سکتا ہے، حیوان بھی اور پیڑ پودا بھی۔ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ میدان حیات کی قوت ہر دن بلکہ ہر گھنٹہ بدلتی رہتی ہے۔ انسان کے خوشگوار اور ہشاش بشاش موڈ اور تھکان کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے ارد گرد موجود میدانِ حیات کی قوت کی پیمائش اس سلسلہ میں نہایت مفید ثابت ہوگی۔ جب کوئی جاندار مرجاتا ہے تو یہ میدانِ حیات بھی ختم ہوجاتی ہے۔ ہاں یہ الگ بات کہ فوراً ہی ایسا نہیں ہوتا۔

عام فرد کے ارد گرد موجود میدان حیات کی قوت میں تبدیلی ایک مخصوص نظام کی پابند ہوتی ہے، چنانچہ اس نظام کا ایک تفصیلی خاکہ بنا کر بہ آسانی یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون انسان کس روز عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا اور کس دن بری کارکردگی کا۔ یہ کارکردگی دفتری بھی ہو سکتی ہے، امتحان کی بھی اور کھیل کے میدان کی بھی۔ کتنی حیران کن بات ہے، ہیں ناں!

اس موضوع پر تحقیق کرنے والے ایک صاحب راوز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میدان حیات کی قوت میں تبدیلی چاند کی تبدیلیوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ اس کی تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ پورے چاند کے وقت میدان حیات مثبت اثر کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں لوگ مختلف انداز میں ردعمل ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ چودھویں کے چاند کے وقت بہت سے لوگ دیوانے ہوجاتے ہیں۔ شاید اس خیال میں کچھ حقیقت ہے۔ آج بھی کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خلا میں موجود کوئی جسم ہمارے میدان حیات کو متاثر کرتا ہے، بالکل یہی بات علمِ فلکیات بھی کہتا ہے۔

ایک اور قدیم خیال یہ ہے کہ انسان کے جسم کے ارگرد Aura یعنی روشنی کا دھبہ موجود رہتا ہے، اور یہ دھبہ چند ہی لوگوں کو نظر آتا ہے۔ جن افراد نے اس دھبہ کو دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک انڈے کی طرح ہے اور اس کے مختلف رنگ ہیں۔ اسے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ نیم اندھیرا ہو اور دیکھنے والے کی آنکھیں آدھی بند ہوں اور وہ گردن گھما کر اسے دیکھنے کی کوشش کرے۔ ۱۹۱۱ء میں کلز نام کے ایک شخص نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ دھبہ درحقیقت آنکھیں بند کر کے نظر آنے والی تصویر (Spectrum) کا زیریں سرخ حصہ ہوتا ہے اور اکثر لوگ اسے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس بات کا امکان ہے کہ روشنی کے اس دھبے کو زیادہ آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ الّو یا چام چڑ وغیرہ جو رات کو شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اپنے شکار کو اسی روشنی کے دھبے کے باعث دیکھ پاتے ہوں۔ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ الّو مکمل تاریکی میں بھی اپنا شکار دیکھ لیتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ الّو اپنی بے مثال سننے کی صلاحیت کو کام میں لاتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں ایک روسی شخص اور کرلین اور اس کی بیوی نے تجربہ سے یہ دریافت کیا کہ وہ فوٹو گرافک پلیٹ اور برقی شعلہ کی مدد سے تصویر اتار سکتے ہیں۔ اس طریقے سے لئے گئے فوٹو گرافوں سے معلوم ہوا کہ ہر جاندار شے کے گرد روشنی کا دھبہ موجود ہے۔ یہ روشنی لال، نیلے، سفید اور پیلے رنگ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میدان حیات کی تصاویر لینے میں کامیاب رہے۔ بہت سے درختوں کی پتیاں درخت سے ٹوٹنے کے فوراً بعد اس روشنی کو ظاہر کرتی ہیں۔ درخت جتنا زیادہ صحت مند ہوتا ہے اتنی ہی اس

میں یہ روشنی موجود ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غیر صحت مند درخت روشنی کا دوسرا نظام رکھتے ہیں۔

ایک بار اس روسی شخص کے پاس ایک صاحب آئے۔ ان کے پاس کسی ایک ہی درخت کی دو ایک جیسی پتیاں تھیں۔ اس شخص نے روسی سائنس دان سے ان پتیوں کے فوٹو لینے کی درخواست کی۔ کرلین صاحب تمام رات ان پتیوں کے فوٹو لیتے رہے۔ اور اس بات پر پریشان ہوتے رہے کہ ان دونوں پتیوں کے ایک جیسے فوٹو نہیں آرہے تھے۔ بالآخر اس نے سمجھا کہ وہ اس کام میں ناکام ہوگیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ صاحب ان کی باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس نے جب اس شخص کو اس بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوا "مجھے امید تھی کہ ان دونوں پتیوں میں روشنی کے دو مختلف نظام موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پتی صحت مند درخت کی ہے اور دوسری غیر صحت مند درخت کی" ان صاحب نے بتایا۔

کرلین اور اس کی بیوی نے برسوں تک اس موضوع پر کام کیا اور لوگوں کو ایسی روشنی کے بارے میں بتانے کی کوشش کی، مگر کسی نے بھی ان کی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں روشنی کا یہ تصور قبول کرلیا گیا۔ یا یوں کہیں تو بہتر ہوگا کہ کم از کم روس میں قبول کرلیا گیا۔ اس کے بعد ایک روسی یونیورسٹی میں کچھ طالب علموں نے اس موضوع پر تحقیق شروع کی کہ کیا تمام جاندار اشیاء اس روشنی یا میدان حیات کے نظام کا تعین خود کرتی ہیں؟ ان لوگوں نے تحقیق کے بعد دریافت کیا کہ وہ جب کسی درخت کے کسی پتے کو کاٹ کر اس کا فوٹو لیتے ہیں تو پتے کا وہ حصہ جو کاٹا گیا ہے اس روشنی کے حصہ کے طور پر نمودار ہوتا ہے۔ اس روشنی کے نظام کو انہوں نے برقی رو قرار دیا۔

ایک روسی ڈاکٹر نے جب انسانی جسم کے فوٹو گرافوں کو غور سے دیکھا تو پایا کہ انسانی جسم کے چند خاص حصوں پر روشنی کے نمایاں نکتے موجود ہیں۔ یہ نمایاں نکتے تمام انسانوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس روسی ڈاکٹر نے انسانی جسم اور ان روشنی والے حصوں کو چینی طریقہ علاج آکیوپنکچر کے ان نشانات سے ملا کر دیکھا جو اب اس طریقہ علاج میں انسانی جسم کے مختلف حصوں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہ روسی ڈاکٹر یہ جان کر حیران رہ گیا کہ انسانی جسم میں روشنی کے نکتوں والے مقامات اور آکیوپنکچر کے نکتوں والے مقامات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چینی لوگ دنیا کے دیگر تمام لوگوں سے ہزاروں سال پہلے انسانی جسم کے اس روشنی والے نظام کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ آکیوپنکچر کے یہ مقامات ۷۵ ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ روشنی کے یہ نکتے ہماری صحت اور احساسات سے کیا تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم یہ بات جان لیں تو یقیناً انسان کو بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔

بہت سے ایسے لوگ جو روشنی کے ایسے نظام سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ صلاحیت

ہمیں ہمارے اطراف میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتا سکتی ہے۔ مثلاً زمین کی مقناطیسی صلاحیت کے بارے میں۔ چاند اور سورج کے زمین پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں۔ وغیرہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ چوں کہ ہم اپنے روز مرہ کے کاموں میں بہت مصروف ہوتے ہیں اس لئے ہمیں ان تبدیلیوں کا علم نہیں ہو پاتا، لیکن اگر ہم اپنے آپ کو باقاعدہ طور پر اس طرح سوچنے کی تربیت دیں کہ ہم کب کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ اور بیرونی دنیا سے ہم تک کون کون سے پیغامات آتے ہیں تو ہم بہ آسانی اپنے اطراف میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت عرصہ ہوا ہم نے آنکھ مچولی میں اپنے مضمون میں ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کو بتایا تھا جو زیر زمین پانی کی موجودگی کے بارے میں ہمیں بتا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں خیال ہے کہ ان کے جسم میں موجود پانی زمین کے اندر موجود پانی سے کچھ خاص قسم کے پیغامات موصول کرتا ہے۔ اور یہ حضرات ان پیغامات کی مدد سے یہ جان جاتے ہیں کہ زمین کہ اندر کہاں پانی موجود ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں اب یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ان افراد کے اندر روشنی کے اس نظام کو کچھ مخصوص اشارے موصول ہوتے ہوں۔ اور ان کی مدد سے یہ ہمیں پانی کی موجودگی کے بارے میں بتاتے ہوں۔

اب اس بارے میں بھی خاصی تحقیق ہو رہی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اسی روشنی کے نظام کے ذریعہ خیالات کی ترسیل کر سکتا ہے۔ یا نہیں۔ ماہرین کی اکثریت اسی بات کی حامی ہے کہ ایسا ممکن ہے۔ ٹیلی پیتھک لوگ جو دوسرے لوگوں کے خیالات پڑھ لیتے ہیں ایسے اشارے وصول کرتے ہیں جو عام لوگوں کے حواس قبول نہیں کر پاتے۔ خیال ہے کہ جانوروں اور پودوں میں خاص پیغامات کو وصول کرنے کی صلاحیت انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بہت سے حیوانات اور جانور سینکڑوں میل تک اپنے پیغامات دوسرے جانوروں اور پودوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کے پیغامات طویل فاصلے اور راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو عبور کر کے اپنی منزل تک کیسے پہنچتے ہیں؟ معلوم نہیں یہ کس طرح کے اشارے ہوتے ہوں گے؟ شاید یہ برقی اشارے ہوتے ہوں، یا شاید مقناطیسی اشارے؟ بہرحال اس بارے میں ہمارے پاس ابھی تک کوئی آخری اور قطعی جواب موجود نہیں ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے ارد گرد موجود اسی روشنی (یا توانائی) کو جمع کر کے استعمال کرنے پر قدرت حاصل کر لیں تو پھر ہم بہت سے خاص لوگوں کی طرح اشیاء کو بغیر چھوئے ہلانے اور لوگوں کے خیالات میں تبدیلی لانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

کرلین نے ایک ایسی لڑکی کی تصاویر کھینچی تھیں جس کے پاس ٹیلی کینسز (چیزوں کو بغیر

چھوئے ہلانے جلانے کی صلاحیت) کی قوت تھی۔ تصاویر سے ظاہر ہوا کہ اس لڑکی کے پاس اس روشنی یا توانائی کی مقدار عام افراد سے کہیں زیادہ تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے روشنی کی لہریں نکل رہی تھیں۔ اس طرح عقیدے کی قوت سے علاج کرنے والے ایک شخص کی تصاویر سے ظاہر ہوا کہ اس کے ہاتھوں اور اس کی انگلیوں سے روشنی کی لہریں..... نکل رہی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کے جسم کے اس حصہ میں اور لوگوں کے برعکس زیادہ توانائی موجود ہے۔ یہاں توانائی سے مراد قوت ہے۔ کچھ کرنے کی قوت۔

اب دنیا میں ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے کھینچی گئی تصاویر سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ کس شخص کے گرد اس خاص روشنی یا توانائی کی کتنی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی تصاویر میں آنے والی ایسی روشنی کو مختلف رنگوں میں تبدیل کر کے ظاہر کیا جاتا ہے۔ عام افراد کے جسموں کے وہ اجزاء جو مردہ کہلاتے ہیں (جیسے بال، ناخن،) تصاویر میں سیاہ دھبوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے جسم کا کوئی حصہ بیمار ہوجائے تو بیماری کی حالت میں اس کے فطری رنگ میں تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہماری دنیا اور ہم خود کیسی کیسی حیرت انگیز صلاحیتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماحول اور خود اپنے اوپر غور و فکر کریں تو بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہوسکتے ہیں جن کے ذریعہ ہم انسانوں کے فائدے کے بہت سے پہلو دریافت کر سکتے ہیں۔ بس شرط غور و فکر ہے۔ اور ہم لوگوں کے پاس اس صلاحیت کی بڑی کمی ہے۔ دیکھئے اس کمی کو کون دور کرتا ہے؟ کیا خبر یہ آپ ہی ہوں؟

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ ــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں

★ ــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے

★ ــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

★ ــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں

★ ــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے — سبزیاں شوق سے کھائیے — ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

ایل ڈوراڈو

تحریر:۔ نینسی فان لان۔ ترجمہ: آصف فرخی

ایل ڈوراڈو، نام کی ایک سنہری سرزمین ہے جو لوگوں کے خوابوں میں بسی ہوئی ہے۔ وہاں کی مٹی بھی سونا ہے اور پانی بھی سونا۔ ہر طرف سونا ہی سونا ہے۔ یہ سرزمین کہاں ہے اور کدھر ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ بہت لوگ اس کی تلاش میں نکلے اور بہتوں نے اس تلاش میں جان گنوائی مگر نہ اس سرزمین کا سراغ ملا نہ سونے کی جھلک نظر آئی۔ سونے کی سرزمین ایل ڈوراڈو ایک ایسا خواب بن گئی ہے جس کی جستجو سب کو ہوتی ہے مگر جس کو حاصل کرنا مشکل ہے، بہت مشکل۔

"ایل ڈوراڈو" کے لفظی معنی ہیں سنہرا شخص، جس کے سارے بدن پر باریک باریک سونا چھڑکا گیا ہو۔ اس روایت کی ابتدا جنوبی امریکا کے ملک کولومبیا سے ہوئی، جہاں کے سرخ ہندی یا انڈین باشندوں کی

زبانی سن کر سیبستیان ڈی بین الکازر نے ۱۵۴۱ء میں درج کیا۔ بین الکازر ان ہسپانویوں میں سے تھا جنہوں نے ایک نئی دنیا دریافت کرنے کے بعد لاطینی امریکہ میں اپنی سلطنت قائم کرلی۔ سولہویں صدی کے ابتدائی حصے میں جب ہسپانیہ کے حملہ آور (جنہیں کون کوئستادور کہا جاتا تھا) اس نئی دنیا میں پہنچے تو انہوں نے وہاں کے قدیم باشندوں سے (جن کو وہ ہندوستانی یا ہندی سمجھتے تھے) بہت ساری ایسی حیرت انگیز اور عجیب و غریب باتیں سنیں۔ ہسپانویوں نے لاطینی امریکہ کے قدیم باشندوں سے اس قدر دولت حاصل کی، اور اتنا سونا اکٹھا کیا کہ انہیں یقین ہو گیا کہ اس سرزمین پر سونے کے بے اندازہ ذخیرے کہیں موجود ہیں۔ سونے کے ان ماخذ کی تلاش، مَن چلے مہم جُو سورماؤں کے لئے ایک چیلنج بن گئی۔ گھنے جنگلوں میں سونے کی تلاش نے ایل ڈوراڈو کا روپ دھار لیا، اور ایل ڈوراڈو کا نام ایک روایت بن گیا، ایسی روایت جس کی ہزاروں شکلیں ہیں۔ صدیوں تک ایل ڈوراڈو کا نام، سپاہیوں اور جرنیلوں، شاعروں اور باشادہوں کے تخیل کو مہمیز کرتا رہا۔ کتنے ہی لوگ اس تلاش میں نکلے۔ سونے کی تلاش میں بہت خاک چھانی، دربدر کی ٹھوکریں کھائیں مگر ایل ڈوراڈو کا پتہ نہ پایا۔ ایسا لگتا تھا کہ بس اب پہنچنے ہی والے ہیں، ایل ڈوراڈو چند قدم کے فاصلے پر ہے، اگلی پہاڑی یا اگلے دریا سے آگے۔ مگر وہ اگلی پہاڑی یا اگلا دریا بھی نظروں سے اوجھل ہوجاتے۔ ریگستان کے سراب کی طرح، ایل ڈوراڈو خوابوں میں بسا رہا، نظروں کے سامنے کبھی نہ آیا۔ کبھی وہ سنہرے بدن کا شخص بن جاتا، کبھی سنہری شہر اور کبھی سنہری سرزمین..... ایسی زمین جس کے خوابوں کا رنگ بھی سنہرا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایل ڈوراڈو کبھی ہاتھ نہیں آیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وہ پراسرار سرزمین کہیں بہت دور نہیں تھی ان کے آس پاس ہی تھی، بس وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہسپانوی مہم جوؤں کو اندازہ نہیں ہوا، ایل ڈوراڈو تو وہ سونا تھا جو لاطینی امریکا کے اصلی اور قدیم باشندوں نے زمین کے سینے سے نکالا اور حسن کے دل کش تصور کے مطابق، اپنے ہاتھوں کی محنت سے ڈھالا۔ ایل ڈوراڈو تو ان لوگوں کا طرزِ حیات تھا جس میں ان کے اپنے عقیدے اور علم کے خزانے تھے جن کے مطابق وہ زندگی گزارتے تھے۔

ہسپانوی فاتح، ظلم اور زبردستی سے اس طرزِ حیات کو ختم کرتے گئے۔ اس لئے ایل ڈوراڈو اوجھل ہوگیا۔ اوجھل ہوا ہے، گم نہیں۔ یہ سرزمین پوشیدہ ہے، دوبارہ دریافت ہونے کی منتظر ہے۔ مگر یہ دریافت فاتح فوجوں کے ہاتھوں سے نہیں ہوگی بلکہ سچی تلاش والوں سے ہوگی۔ ایل ڈوراڈو کی اصلی دولت، صرف سونا نہیں ہے۔ ایل ڈوراڈو روح کی پاکیزگی کا وہ شہر ہے جس میں داخل ہونے کے لئے سچی لگن اور قلب کی صفائی ضروری ہے۔

ایل ڈوراڈو کی بے شمار روایتیں ہیں، اور اس کے رومانوی اور الم ناک پہلو کی وجہ سے بار ہا دہرایا گیا ہے۔ ایل ڈوراڈو کی کہانی کا جو روپ آپ یہاں پڑھیں گے، وہ سیبستیان بین الکازور کی قدیم تاریخ پر مبنی لاطینی امریکا کی مصورہ بیاتریز و ڈال نے، جن کا تعلق ارجنٹینا سے ہے، اپنے بچپن میں یہی کہانی سنی تھی کہ ایل ڈوراڈو نام کی سنہری سرزمین ہے جہاں کے لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ بیاتریز و ڈال نے اس کہانی کو الفاظ میں بھی بیان کیا ہے اور بے حد دلآویز رنگین تصویروں سے بھی۔ تصویروں کو الفاظ میں ڈھالنے کا کام نینسی فان لان نے کیا ہے۔ ان دونوں کی بیان کی ہوئی کہانی کا ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

◆

ہزاروں برس پہلے جب زمین پر جانور تھے نہ انسان، اجلا روپہلا چاند، سورج کی روشنی سے چکا چوند ہو گیا اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ یہ آنسو بھی چاند کی طرح گول تھا اور زمین پر گر کر جھیل گواٹاویٹا بن گیا جو دنیا کی باقی تمام جھیلوں کے مقابلے میں مقدس اور متبرک مانی جاتی تھی۔

چبچا قبیلے کے سرخ ہندیوں نے سب سے پہلے جھیل گواٹاویٹا کو دیکھا، اور اسے چاند کا تحفہ جان کر خوش ہوئے۔ مگر ایسے لوگ بھی تھے جو چاند کی شکل کی اس جھیل سے ڈرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک مہیب اژدہا اس جھیل کی تہہ میں سو رہا ہے، اور جب کسی نے اس جھیل کے ساکن پانی کو چھوا، وہ اژدہے کو جگا دے گا اور پھر کبھی زندہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اس جھیل کے کنارے چبچا قبیلے کا بادشاہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔

ان کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے جن میں زمرد کی کانیں تھیں۔ پہاڑ، سمندر کی طرح گہرے سبز رنگ کے تھے۔ ان میں جا بجا ندیاں بہتی تھیں، ان کا پانی لہراتا، دھوپ میں جھلملاتا۔ ان ندیوں میں سونا بھرا ہوا تھا۔ زمرد اور سونے سے چبچا لوگ خوبصورت اور دلکش زیور، آرائشی نقاب اور زرہ بناتے۔

ایک دن صبح سویرے، بادشاہ کی بیوی اور بیٹی ہرے بھرے جنگل میں سے گزر رہی تھیں کہ ننھی منی شہزادی نے جھیل گواٹاویٹا کو درختوں کے درمیان جھلملاتے، چمکتے، دھوپ میں لہراتے دیکھا۔ پانی کی جھلملاہٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس سے پہلے کہ اس کی ماں اسے روک سکتی، شہزادی دوڑتی ہوئی پانی کے پاس پہنچ گئی اور ایک لکڑی لے کر اس کی سطح پر لہریں بنا دیں۔ ساکت پانی میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

سورج گھنیرے درختوں کے درمیان ڈوب گیا۔ دن ڈھل گیا۔ روشنی چھپ گئی۔ خوفزدہ ہو کر ملکہ نے اپنی بیٹی کو یہاں سے گھسیٹ کر لے جانا چاہا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ پانی کی شانت سطح پر ایک سایہ

ابھرا اور انہیں دعوت دینے لگا کہ جھیل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں .... جہاں بے حد چمک دار زمردیں اژدہے کی یاقوتی آنکھیں جگر جگر کر رہی تھیں۔

عین اسی وقت سورج کی روشنی لوٹ آئی اور جھیل کی سطح پر بنا ہوا نقش دھندلا ہو کر غائب ہو گیا۔ ملکہ تھرا اٹھی، اور اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاؤں کے حفظ و امان میں لے آئی۔

اور بعد میں جب وہ بادشاہ کو سنانے لگی کہ اس نے کیا دیکھا ہے تو اس کا ڈر ہوا ہو گیا۔ "اس قدر حسین سانپ ہے!" وہ کہنے لگی۔ "اس کی کینچلی زمرد کی بنی ہوئی ہے، اس کی آنکھیں یاقوتی ہیں، اور اس کی نظر اتنی مسحور کن ہے کہ میرا جی چاہتا ہے ہر وقت اسے ہی تکتی رہوں!"

بادشاہ پریشان ہو گیا اور اس نے ملکہ کو خبردار کیا کہ آئندہ پھر کبھی جھیل گواٹاویٹا کے نزدیک بھی نہ پھٹکے۔

مگر اس رات ایک سپنے نے ملکہ کو جگا دیا۔ اندھیرے میں دو یاقوتی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

اور رات ڈھلنے سے پہلے، پو پھٹنے سے پہلے، سوتی شہزادی کو گود میں لئے، ملکہ ان یاقوتی آنکھوں کے پیچھے پیچھے جھیل گواٹاویٹا تک چلی آئی۔

صبح بادشاہ کی آنکھ جو کھلی تو اس نے دیکھا کہ ملکہ اور شہزادی غائب ہیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو بھیجا کہ علاقے کا چپہ چپہ چھان ماریں۔ دل ہی دل میں، اسے معلوم تھا کہ ان پر جھیل کے اژدہے کا جادو چل گیا ہے۔

جب کسی جگہ سے کوئی سراغ نہ ملا، تو بادشاہ اور اس کے آدمی جھیل کے کنارے آئے۔ جب وہ جھیل کے کنارے پہنچے تو بادشاہ پکار اٹھا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی بیوی اور بیٹی کے عکس، پانی کی سطح پر ابھر رہے ہیں۔ مگر عین اس وقت زور کی ہوا چلی، پانی کی سطح پر ہلچل ہوئی اور وہ عکس غائب ہو گیا۔

پھر دھیرے دھیرے پانی کے اندر سے ملکہ کا چغہ اور شہزادی کے سر کی چادر ابھر کر سطح پر آئے۔ بادشاہ کو احساس تھا کہ وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے اس نے منہ موڑ لیا اور دکھے دل کے ساتھ واپس چلا گیا۔

بادشاہ بوجھل قدموں سے واپس آگیا۔ اب وہ بہت اداس تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی جھیل میں یوں غائب ہو گئیں جیسے پانی میں ڈوب جانے والا پتھر۔ اب وہ طاقت ور نہ رہا۔ اس کی قوت اور ذہانت، کسی پرانے خواب کی طرح ہو کر رہ گئی۔ اور چبچا قبیلے کے لوگ بھی مطمئن اور پرسکون نہ رہے .... ان کا بادشاہ سوکھے ہوئے پتے کی طرح اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔

اب دوسرے قبیلے ان پر حاوی ہو جائیں گے۔ ان کی زمین چھن جائے گی۔ ان کے خزانے دوسروں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ "نہیں! نہیں!" چبچا لوگ پکار اٹھے۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

پریشان ہو کر قبیلے کے راہب ایک جگہ جمع ہوئے کہ صورت حال پر غور کریں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کوئی ایسا راستہ ڈھونڈنا چاہئے جو ہمارے بادشاہ کا حوصلہ بلند کرے۔

سب سے بڑے پروہت نے ہاتھ اٹھا کر کہا "جلد ہی پورے چاند کی رات آنے والی ہے۔ ہم جھیل کے کنارے جمع ہو کر اژدہے کے بولنے کا انتظار کریں گے۔"

جب پورے چاند کی رات آئی، تو چبچا قبیلے کے سارے لوگوں نے جھیل گواٹاویٹا کو گھیر لیا۔ دھیرے دھیرے چاند نمودار ہوا، اور جھیل کے ساکت پانی پر روشنی کا دائرہ بن کر لہرانے لگا۔

جھیل کے کنارے مقدس آگ روشن تھی، ڈھول بج رہے تھے اور قبیلے کے رقاص اس آہنگ پر تھرک رہے تھے۔ قبیلے کے لوگ زیر لب دعایں پڑھ رہے تھے۔

اچانک چاند دھند کے بادل میں کھو گیا، اور تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ سائے سمٹ گئے۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے پانی پر موجیں اٹھ رہی تھیں، اور موجوں کی غضب ناک آواز میں ایک پیغام تھا۔

جب دھند چھٹ گئی تو چاند دوبارہ نکل آیا اور جھیل کے پرسکون پانی پر نور کا دائرہ ہلکورے لینے لگا۔

"اژدھے نے جواب دے دیا ہے۔" بڑے پروہت نے بادشاہ سے کہا۔ "تمہاری بیوی اور بچی اژدہے کے محل میں بہت خوش ہیں؟"

"مگر میں کیا کروں کہ ان کے پاس پہنچ جاؤں؟" بادشاہ نے کہا۔ چاند کی روشن پرچھائیں ایک بار پھر جھیل میں ڈوب گئیں اور اونچی موجیں غصے سے سر پٹخنے لگیں۔

"تمہارا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔" پروہت نے کہا۔ "تمہیں ابھی ملک پر ایمان داری اور دانش مندی سے حکومت کرنا ہے۔ اور ایک وقت ایسا آئے گا جب تم اپنے بچھڑے ہوؤں سے دوبارہ جاملو گے۔"

اچانک جھیل کی سطح کا تلاطم تھم گیا۔ موجیں پرسکون ہو گئیں اور چاند کے نرم نرم نور نے انہیں تھپک تھپک کر سلا دیا۔ بادشاہ گاؤں واپس چلا آیا اور دانش مندی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ اور ایک بار پھر چبچا قبیلہ امن چین سے رہنے لگا۔

مگر دل ہی دل میں بادشاہ کو خوف تھا کہ اژدہا اپنا وعدہ نہ بھول جائے۔ اژدہے کو اپنا وعدہ یاد دلانے کے لئے بادشاہ اور اس کے قبیلے نے ایک رسم ایجاد کی۔

سال میں ایک بار چیچا قبیلے کے لوگ اپنے بادشاہ کے سارے بدن پر خوش بو دار تیل لگاتے، پھر سونے کو باریک باریک پیس کر اس کے سارے بدن پر چھڑک دیتے۔ اب وہ "ایل ڈوراڈو" بن گیا، یعنی سنہری شخص، کیونکہ اس کا سارا جسم سونے سے ڈھکا ہوا تھا۔ شاہی تخت پر بٹھا کر بادشاہ کو جھیل کے کنارے تک لایا جاتا۔

جوں ہی دن ڈھلتا اور سورج ڈوب جاتا، اسے شاہی بجرے پر بٹھا دیا جاتا اور بجرے کو زمرد اور یاقوت سے بھر دیا جاتا۔ بجرا پانی پر ہولے ہولے بہنے لگتا اور فضا میں ڈھول اور بانسری کی آواز، پروہت کی دعائیں گھل جاتیں۔ جب بجرا جھیل کے بیچوں بیچ پہنچتا تو یک لخت تمام آوازیں تھم گئیں۔

جھیل کے عین وسط میں پہنچ کر، بجرے پر کھڑے ہو کر بادشاہ نے اژدہے کو پکارا اور اسے یاد دلایا کہ میری بیوی اور بیٹی کی نگہبانی کرنا ان کا خیال رکھنا۔ جوں جوں وہ یہ الفاظ اور دعائیں ادا کرتا گیا بجرے پر لدے ہوئے قیمتی خزانے ایک ایک کر کے جھیل گواٹاویٹا کے اندر پھینکتا گیا۔

جب سارے خزانے پانی میں پھینک دیئے گئے اور بجرے میں کچھ نہ بچا تو بادشاہ نے جھیل کے پانی میں چھلانگ لگا دی اور آخری تحفے کے طور پر اپنے بدن پر لگا ہوا سونا پیش کیا۔

اس کے بدن پر لگا ہوا سونا جھیل کے پانی نے اتار لیا۔ جگ مگ جگ مگ سونے کا دائرہ، چاند کی طرح گول، جھیل کی سطح پر ابھر آیا اور ڈھلتے سورج کی کرنوں میں دمک اٹھا لوگوں نے نعرے بلند کیئے، اور بادشاہ تیرتا ہوا واپس کنارے تک آ گیا۔

سال ہا سال یہ رسم ادا ہوتی رہی، یہاں تک کہ اژدہے نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اژدہے کی یاقوتی آنکھوں نے اسے بھی سحر انگیز بلاوا دیا اور بادشاہ جھیل میں اتر گیا۔ جھیل کی تہہ میں وہ اپنے بچھڑے ہوئے خاندان سے پھر مل گیا۔

چیچا قبیلے کے ہر آنے والے بادشاہ نے یہ رسم جاری رکھی تاکہ جھیل کا اژدہا ان کے لوگوں کو محفوظ رکھے آج بھی ایل ڈوراڈو کے بیش بہا خزانے جھیل گواٹاویٹا کی تہوں میں پوشیدہ ہیں۔

بھیک

وہ ایک گرم ترین دن تھا۔ بس اسٹاپ پر بے پناہ رش تھا۔ سب لوگ گرمی سے نڈھال بس کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک فقیر آیا سب سے بھیک جمع کی اور رکشے میں بیٹھ کر چلا گیا۔

صائمہ۔ سلمیٰ ستار فاضلاتی کراچی

ٹراؤٹ مچھلی

تحریر:۔ جیرم لاپکا جیرم ترجمہ تخلیص اخگر انوار اعوان

اگر آپ کو کبھی فراغت کی کوئی شام میسّر آئے اور آپ دریا پر پکنک منانے جائیں تو میرا مشورہ یہ ہے کہ راستے میں کسی چھوٹی سی سرائے میں کچھ دیر قیام ضرور کیجئے گا۔ مجھے یقین ہے یہاں آپ کی ملاقات کسی ایسے بوڑھے مچھیرے سے ضرور ہوگی جو آپ کو بیس پچیس منٹ میں مچھلیوں کے اتنے ڈھیر سارے قصے سنا دے گا جنہیں آپ شاید مہینہ بھر میں بھی ہضم نہ کر سکیں۔

اس روز ہیرس تو سہ پہر کو ہی شیو بنا کر نکل گیا تھا، میں اور جارج اپنے کتے کو ساتھ لئے والنگ فورڈ (Walling ford) سیر کو گئے۔ واپسی پر کچھ آرام وغیرہ کی غرض سے دریا کنارے واقع ایک چھوٹی سی سرائے میں ٹھہر گئے۔ ہم کمرے میں داخل ہو کر زمین پر بیٹھ گئے اس وقت وہاں ایک

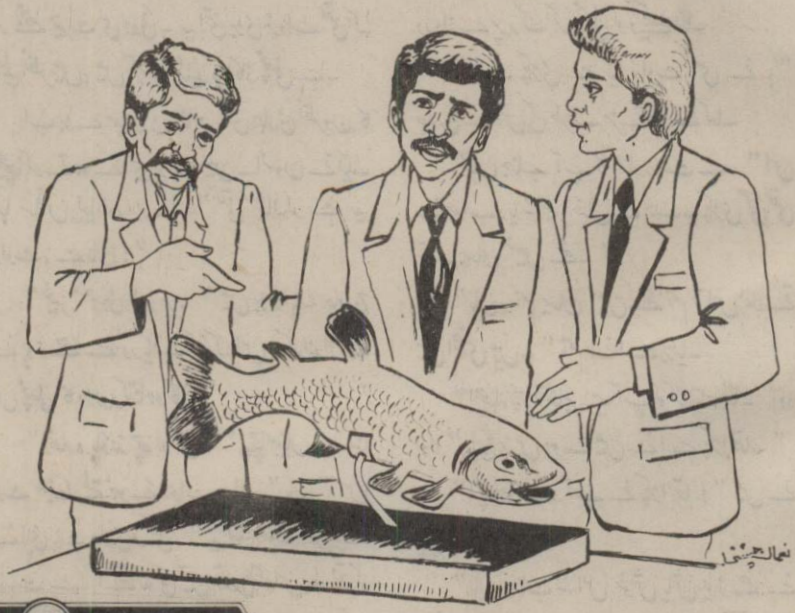

بڑے میاں مٹی کا بنا ہوا لمبا سا پائپ پی رہے تھے۔ ظاہر ہے ان سے گپ شپ کا کوئی بہانا چاہئے تھا۔ ہم نے ان کو بتایا کہ کل موسم اچھا تھا۔ وہ بولا، "آج موسم اچھا ہے۔" اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے پر خیال ظاہر کیا کہ آئندہ کل موسم اچھا ہوگا۔ پھر کسی نہ کسی طرح سے یہ بات نکل گئی کہ ہم اس جگہ اجنبی ہیں اور یہ کہ آئندہ کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

اس کے بعد گفتگو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہری، جس دوران ہماری آنکھیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں اور آخر کار ایک گرد آلود شیشے کے بکس پر جا کر رک گئیں جو آتشدان کے اوپر پڑا تھا اور جس میں حنوط شدہ ٹراؤٹ مچھلی رکھی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ یہ اتنی بڑی ٹروٹ تھی کہ پہلی نظر میں، میں سمجھا، شاید یہ کاڈ مچھلی ہے۔

اب بڑے میاں کی نگاہیں بھی ہماری نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے اسی پر جا رکیں۔ انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور بولے۔ "کتنی شاندار ہے یہ ٹراوٹ، ہے ناں!"

"غیر معمولی طور پر۔" میں بڑبڑایا۔ جارج نے بوڑھے سے دریافت کیا کہ اس کے اندازے میں مچھلی کا وزن کتنا ہوگا۔

"اٹھارہ پاؤنڈ چھ اونس۔" چچا میاں نے لپنا کوٹ سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں" اس نے اپنی بات جاری رکھی، "یہ کوئی سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اگلے ماہ کی تین تاریخ کو اس واقعے کو پورے سولہ سال ہو جائیں گے جب میں نے اسے پل کے نیچے سے کانٹے کے ساتھ چھوٹی مچھلی لگا کر پکڑا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں ایک بڑی مچھلی موجود ہے اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے پکڑ کر ہی دم لوں گا۔ چنانچہ میں نے اسے قابو کر ہی لیا۔ میرے خیال میں آج کل آپ کو یہاں اس سائز کی ٹراوٹ نہیں ملے گی۔ اچھا دوستو شب بخیر، میں تو چلا، شب بخیر۔"

یہ کہہ کر وہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد تو ہم نگاہیں اس مچھلی پر سے ہٹا ہی نہ سکے۔ یہ واقعی غیر معمولی طور پر شاندار چیز تھی۔ ہم ابھی اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھے کہ ایک مقامی مزدور سرائے کے اندر داخل ہوا اور کمرے کے دروازے پر رک کر مچھلی کو دیکھنے لگا۔

"خوب پکڑی ہے یہ ٹراوٹ کسی نے!" جارج نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں جناب آپ کا کہنا درست ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے جب یہ پکڑی گئی تھی آپ یہاں نہیں تھے۔"

"ہاں، ہم یہاں نہیں تھے، ہم تو اس علاقے میں اجنبی ہیں۔" ہم نے اسے بتایا۔

"اچھا، پھر تو ظاہر ہے آپ کو کیا پتا ہوگا۔" وہ بولا "پانچ برس ہوئے میں نے اسے پکڑا تھا۔"

"اچھا تو اسے آپ نے پکڑا تھا!" میں نے پوچھا۔

"ہاں جناب" اس خوش باش بوڑھے نے

جواب دیا۔ "یہ جمعہ کی سہ پہر تھی جب میں نے اسے نہر کے لاک کے نیچے پکڑا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ میں نے اسے بنسی سے پکڑا تھا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے، اس روز میں پائیک (Pike) مچھلی کے شکار کو نکلا تھا۔ ٹراوٹ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ مجھے ڈوری کے سرے پر کوئی بڑی سی چیز دکھائی دی۔ اللہ آپ کا بھلا کرے، مجھے ڈر تھا کہ یہ مجھے اندر نہ کھینچ لے۔ بڑی مشکل سے اسے کھینچ باہر کیا۔ اس وقت اس کا وزن ۲۶ پاؤنڈ نکلا تھا۔ اچھا دوستو شب بخیر۔"

پانچ منٹ کے بعد ایک تیسرا آدمی آیا اور بتانے لگا کہ کس طرح اس نے ایک روز علی الصبح اس ٹراوٹ کو ایک بلیک (Bleak) مچھلی کانٹے سے لگا کر پکڑا تھا۔ وہ چلا گیا تو ایک بے حس خاموش صورت ادھیڑ آدمی ادھر آنکلا اور کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک ہم میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ تب جارج اس نئے آنے والے کی طرف مڑا اور بولا "معاف کیجئے۔ امید ہے آپ ہم جیسے اجنبیوں کی گستاخی کو نظر انداز کر دیں گے، میں اور میرا ساتھی بہت مشکور ہوں گے اگر آپ ہمیں یہ بتا دیں کہ ٹراوٹ، جو وہ سامنے پڑی ہے آپ نے کیسے پکڑی تھی۔"

وہ حیران ہو کر بولا "کیوں، آپ کو کس نے بتایا کہ یہ مچھلی میں نے پکڑی تھی؟"

ہم نے اسے جواب دیا کہ کسی نے ہمیں نہیں بتایا بلکہ خود بخود ہمارے دل نے گواہی دی ہے کہ ضرور اس ہی نے وہ مچھلی پکڑی ہوگی۔

"بہت خوب، بہت خوب۔" وہ بے حس اجنبی کہنے لگا۔ "آپ صحیح کہتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اسے میں نے ہی پکڑا تھا۔ لیکن آپ نے بھی خوب اندازہ لگایا، بہت خوب۔"

اس کے بعد اس نے وضاحت کی کہ کس طرح اس مچھلی کو خشکی تک کھینچ لانے پر اس کا آدھا گھنٹہ ضائع ہوا۔ اس کی بنسی بھی اس کوشش میں ٹوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے بڑی احتیاط سے اس کا وزن کیا جو چونتیس پاؤنڈ نکلا۔ اس کے بعد وہ چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد سرائے کا مالک وہاں آنکلا ہم نے اسے وہ تمام داستانیں سنائیں جو اس ٹراوٹ کے بارے میں ہم تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ انہیں سن کر بہت محظوظ ہوا اور ہم بھی خوب کھل کر ہنسے۔

"کتنے مزے کی بات ہے کہ جم بیٹس، جو مگلز اور مسٹر جانز اور بڑے میاں بلی مانڈرز ہر ایک نے آپ کو یہی بتایا ہے کہ یہ اس کا کارنامہ ہے۔ ہاہاہا! واقعی کیا خوب واقعہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے یہ راست باز بوڑھا خوب ہنسا "اگر ان میں سے کسی نے اسے پکڑا ہوتا تو کیا وہ مجھے یہ مچھلی اپنے کمرے میں رکھنے کے لئے دے دیتا؟ ہاہاہا! یہ بھی خوب رہی۔"

پھر اس نے ہمیں اصل واقعہ بتایا جس سے پتہ چلا کہ حقیقت میں تو مچھلی اس بے چارے نے پکڑی تھی۔ بہت عرصہ پہلے جب وہ ابھی بچہ ہی تھا، وہ

اسکول سے بھاگ کر مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ وہ کوئی ماہر مچھیرا نہ تھا بلکہ اتفاقیہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور یہ بڑی مچھلی اس کی ڈوری میں پھنس گئی۔ اس روز سہ پہر کو سورج چمک رہا تھا اور وہ ایک درخت کی شاخ لے کر اس کے ساتھ ڈوری باندھ کر مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس مچھلی کو پکڑنے کی وجہ سے وہ اسکول میں پٹائی سے بچ گیا اور اساتذہ نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

عین اس لمحے کسی نے اسے باہر سے آواز دی اور میں اور جارج دوبارہ مچھلی کو غور سے دیکھنے لگے۔ یہ واقعی بڑی حیران کن ٹراوٹ تھی۔ جتنا ہم اسے دیکھتے اتنی ہی ہماری حیرانگی بڑھتی جاتی۔

لیکن جارج پر تو گویا جنون سا سوار ہو گیا۔ وہ ایک کرسی کی ٹیک پر چڑھ کر اسے قریب سے دیکھنے لگا کرسی یکدم پھسل گئی۔ جارج نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے مچھلی کے کیس کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی دھڑام سے نیچے آرہا۔ جارج کرسی سمیت اس کے اوپر گرا۔

"میں اسے بچانے کے لئے چیختے ہوئے اس کی طرف دوڑا اور چیختے ہوئے پوچھا "تم نے مچھلی کو تو نقصان نہیں پہنچایا؟"

"نہیں، نہیں" اس نے جواب دیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

لیکن وہ مچھلی کا بیڑا غرق کر چکا تھا۔ مچھلی ہزار کے قریب ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھی۔ ہزار نہیں تو نو سو تو ہوں گے ہی، کیونکہ میں نے انہیں گنا نہیں تھا۔

ہمارے لئے یہ بات بھی بڑی حیران کن تھی کہ ایک حنوط شدہ ٹراوٹ کے اتنے سارے ٹکڑے کیسے ہو گئے تاہم اگر یہ حنوط شدہ مچھلی ہوتی تو یہ واقعی بڑے تعجب کی بات ہوتی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہ محض پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی ایک مچھلی تھی۔

جو یوں ہو گا تو کیا ہو گا

جارج برناڈ شاہ ایک بہت لائق اور عالم فاضل مصنف تھے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ زیادہ اچھے نہ تھے ایک دفعہ ایک خوبصورت خاتون ان کے پاس آئیں اور شادی کی درخواست کی اور کہا جب ہمارے بچے پیدا ہوں گے تو وہ میری طرح خوبصورت اور آپ کی طرح عقل مند ہوں گے۔ برناڈ شاہ مسکرا کر بولے اگر ہمارے بچے آپ کی طرح بیوقوف اور میری طرح بدصورت ہوئے تو.....

مرسلہ، منصور ساجد، گجرات

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر تر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

پیامِ اخوّت

تنویر پھول، کراچی

جہاں سے تعصب مٹاتے چلو تم
اخوت کا نغمہ سناتے چلو تم
کدورت کی ظلمت کرو دور یکسر
چراغِ محبت جلاتے رہو تم
سکھا دو مروّت سے رہنا سبھی کو
لڑائی کی بنیاد ڈھاتے چلو تم
کھلیں جن کی شاخوں پہ گلہائے الفت
چمن میں وہ پودے اگاتے چلو تم
زمانے سے نفرت کو یکسر مٹا کر
اخوت کا پرچم اڑاتے چلو تم
یہی پھول کہتا ہے کہ اب ساتھیوں سے
یہ پیغام سب کو سناتے چلو تم

دو آنسو

علی اکمل قصوری

۱۰۔ جولائی ۱۹۹۱ء

جب میں کسی انسان کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہوں تو میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے ہمارے کسی بزرگ نے کہا ہے کہ انسانی زندگی پانی کی مانند ہے۔ پانی رواں رہے تو صاف اور پاکیزہ رہتا ہے۔ اور جب ٹھہر جاتا ہے تو جوہڑ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اسی لئے میں مہم پسند ہوں اور مہم جوئی کے مواقع کالج میں کچھ زیادہ ہی ملتے ہیں۔ کالج میں کئی لڑکے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کالج آئے کلاسیں لیں اور چھٹی کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے نا کوئی خطرہ .... نا کوئی انفرادیت .... شاید یہی وجہ ہے میں کالج کی سرگرم تنظیم کا اہم رکن ہوں۔

ابھی پرسوں کی بات ہے میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ ہمیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں کالج جانا تھا۔ ہم بسوں کو مسلسل رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ لیکن کوئی بس رکنے کو تیار ہی نہ تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میرے کہنے پر تمام دوست سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہوگئے۔ اچانک ہمیں دور سے سرخ رنگ کی بس آتی نظر آئی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے نزدیک آ رہی تھی۔ میرے ساتھی ڈر کر فٹ پاتھ کی طرف دوڑ گئے لیکن میں سڑک کے بیچ میں کھڑا بس کو گھورتا رہا۔ اور پھر ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ اور بس مجھ سے نصف گز کے فاصلے پر رک گئی ہم پھلانگیں مارتے بس میں سوار ہوگئے۔ میرے ساتھی میری بہادری کی تعریفیں کر رہے تھے۔ میں

جیسے فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ بس کے مسافر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے ہیں۔

۲۵۔ اگست ۱۹۹۱ء

آج میں بہت پریشان ہوں، نہ جانے اب میرا کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ پرنسپل صاحب مجھے کالج سے نکال دیں گے ..... پھر کیا ہوگا؟ میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا ..... آج مجھے اپنی غلطیوں کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ لیکن ..... کیا کروں پچھلے دنوں مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ان دنوں میں بہت پُرجوش تھا۔ جب کالج میں الیکشن ہوتے ہیں تو میں بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ خوشی مجھے اتنی مہنگی پڑے گی۔ پرسوں میری وجہ سے کالج میں ہنگامہ ہو گیا۔

میں طالب علموں کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ ہمیں منتخب کریں۔ ایک طالب علم نے مخالفت کی تو میں نے اسے پیٹ کر رکھ دیا ..... اس کے ساتھیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ نتیجتاً میرے ساتھی بھی آ گئے۔ اور پھر وہ ہنگامہ ہوا کہ پولیس کو آنا پڑا۔ جب تفتیش ہوئی تو میرا نام سامنے آ گیا۔ میں چھپا چھپا پھر رہا تھا۔ جن کے لئے میں نے ہنگامہ کیا تھا، انہوں نے ہی مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ کوئی میری مدد کو تیار نہیں تھا۔ میرے گھر والے ابھی تک اس تمام واقعے سے بے خبر تھے۔ میرے دوست نے مجھے پرنسپل صاحب کا پیغام دیا تھا کہ میں ان سے ان کے دفتر میں مل لوں۔

کل رات میں جب آوارہ گردی کر کے گھر پہنچا تو عظمیٰ، نبیل اور سلیم دوڑ کر آئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنی بہن بھائیوں کا یہ پیار دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میں سب کچھ بھول گیا۔ آدھے گھنٹے تک میں ان سے باتیں کرتا رہا، اور پھر باتھ روم میں نہانے کے لئے چلا گیا۔

عظمیٰ کی عمر ۱۲ سال ہے۔ نبیل ۸ سال کا ہے۔ جب کہ سلیم کی عمر ۵ سال ہے۔ میں جب فارغ ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے سلیم اور نبیل کو فرش پر بیٹھے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ سلیم لکڑی کے چند ٹکڑوں کو ترتیب سے کھڑا کر رہا تھا۔ نبیل اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اچانک سلیم نے خوش ہو کر کہا "نبی بھائی ..... دیکھو میرا گھر بن گیا۔" اس کی یہ معصوم بات سن

کر میں ہنس پڑا۔ نبیل اور سلیم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اچانک نبیل نے ہاتھ مار کر لکڑیوں کا ڈھانچا گرا دیا۔ شاید کسی بات پر ان دونوں میں اختلاف ہو گیا تھا۔ سلیم رونے لگا۔ پھر غصے میں آکر سلیم نے نبیل کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم نے میرے گھر کو توڑ دیا..... تم نے میرے گھر کو توڑ دیا۔" اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے تھے۔ میں جلدی سے اسے چپ کرانے لگا۔ لیکن سلیم کی باتوں نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ ساری رات اس کی بات میرے دماغ میں گونجتی رہی۔ صبح جب میں اٹھا تو بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ناشتہ کیا اور کالج روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پرنسپل صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ میں ان کے دفتر میں چلا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک میری نظر پرنسپل صاحب کی کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر پر پڑی۔ میں جیسے کانپ کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ تصویر مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔ میں جلدی سے اٹھا اور تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اچانک قائداعظم کی آواز میرے کانوں میں ٹکرائی۔

"علی یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیا کیا میں نے..... کچھ بھی نہیں۔" میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

"علی بنیادی طور پر تم ایک طالب علم ہو۔ تمہارا مقصد صرف اور صرف تعلیم حاصل کرنا ہے لیکن تم تو کسی اور ہی راستے پر چل نکلے۔ علی میں نے اور میرے ساتھیوں نے یہ ملک بہت کوشش کے بعد حاصل کیا تھا۔ پھر یہاں پر مسلمان آباد ہوئے۔ وہ سندھی بھی تھے، پنجابی بھی تھے، بلوچی بھی تھے۔ لیکن کسی کو اس بات سے غرض نہیں تھی۔ وہ بس اتنا جانتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان ہمارا گھر ہے۔ کالج بھی ایک گھر ہوتا ہے۔ تمام پڑھنے والے اس کے مکین ہوتے ہیں۔ لیکن علی تم نے اس گھر کو نقصان پہنچایا ہے۔ تم نے میرا گھر توڑ دیا ہے..... تم نے میرا گھر توڑ دیا ہے۔"

اس وقت مجھے قائداعظم کی آنکھوں سے دو آنسو گرتے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ان کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسی وقت کمرے میں پرنسپل صاحب کی آواز گونجی۔

"علی تم قائداعظم کی تصویر پر ہاتھ کیوں پھیر رہے ہو۔"

"سر..... ان کے آنسو صاف کر رہا ہوں۔" بے خودی کے عالم میں میرے منہ سے آواز نکلی۔

سائنسی معلومات

افتخار احمد لودھی، ڈی جی خان

☐ ..... وہیل مچھلی کی اوسط عمر ۵۰۰ برس ہوتی ہے۔

☐ ..... ایک ریشم کا کیڑا اپنی اوسط زندگی میں تقریباً ۱۰۰ گز ریشم پیدا کرتا ہے۔

☐ ..... مچھر کی اوسط زندگی تقریباً ایک ماہ ہوتی ہے۔

☐ ..... سورج کا قطر تقریباً آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار (۸،۶۴۰۰۰) میل ہے۔

☐ ..... روشنی کی رفتار تقریباً ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱،۸۶۰۰۰) میل فی سیکنڈ ہے۔

☐ ..... ایک جوان آدمی کے جسم پر تقریباً ۱۸ مربع فٹ جلد ہوتی ہے۔

☐ ..... ایک صحت مند انسان میں تقریباً ۳ کلو گرام خون ہوتا ہے۔

☐ ..... زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ (۹،۳۰۰۰۰۰) میل ہے۔

مختصر ترین انگز کا میچ

عامر محمود

انگلستان کے ایک دیہات کے نزدیک "کاوڈ" نامی کرکٹ کے کلب نے اپنے مخالف کلب "ڈرنگ ہاوسز" کو سینٹر لیگ کے ایک میچ میں حیرت انگیز طور سے دو رنز کے اسکور پر آؤٹ کر دیا۔ اور اس طرح جب "کاوڈ کرکٹ کلب" کے اوپنر "جم یار" اور لی "فرانس" بیٹنگ کرنے گئے تو انہیں ایک گیند کھیلنا نصیب نہیں ہوئی اور ان کی ٹیم فتح سے ہمکنار ہوگئی۔ یہاں سب سے دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ "کاوڈ" نامی کلب نے یہ میچ بغیر کوئی گیند کھیلے جیت لیا اور "ڈرنگ ہاوسز" نامی کلب بغیر کوئی بال کرائے یہ میچ ہار گئی۔ ہوا یوں کہ "ڈرنگ ہاوسز کلب" کی جانب سے پھینکی جانے والی پہلی بال "وائیڈ بال" قرار دی گئی۔ وہ اس طرح کہ گیند وائیڈ تھی کہ اسے نہ تو بلے باز کھیل سکا۔ اور نہ ہی وکٹ کیپر روک سکا۔ اور گیند باؤنڈری کے باہر چار رنز کے لئے چلی گئی۔ اور یوں کرکٹ کی تاریخ میں بغیر کوئی بال کے میچ کی فتح و شکست کا فیصلہ ہوگیا۔

صرف ایک منٹ میں...

عدنان ممتاز، سعودی عرب

- ...... ایک منٹ میں پوری دنیا میں (۱۴۰۰) مکعب فٹ بارش ہوتی ہے۔
- ...... زمین اپنے محور کے گرد (۹۵۰) میل کا چکر لگاتی ہے۔
- ...... (۶۰،۰۰،۰۰۰) سگریٹ پئے جاتے ہیں۔
- ...... (۱،۱۰،۰۰۰) اخبارات فروخت ہوتے ہیں۔
- ...... (۴۰۰۰) ٹن خوراک کھائی جاتی ہے۔

مینارِ پاکستان

عامر تاج

آج سے تقریباً اڑتالیس سال قبل یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا۔ اس پارک کو اب "اقبال پارک" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تاریخی اجلاس قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

یہ وہ تاریخی دن تھا جب "منٹو پارک" لاکھوں مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مسلم اکابرین موجود تھے۔ سب سے پہلے نواب زادہ خان لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی سالانہ روداد پڑھی اس کے بعد شیر بنگال مولوی فضل الحق نے انگریزی میں "قرار داد پاکستان" پیش کی۔ اس قرار داد میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد اور خود مختار مملکت کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔

اس قرار داد کو "قرار داد پاکستان" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو اپریل ۱۹۴۱ء میں مدراس میں منعقد ہوا اس قرار داد کو مسلم لیگ کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔

تاریخی "قرار داد پاکستان" کو آزادی کی قرار داد یا نئی ریاست کی تشکیل کی قرار داد کہا جا سکتا ہے۔ لاہور میں اس مقام پر جہاں یہ قرار داد منظور ہوئی یادگار کے طور پر ایک مینار تعمیر کیا گیا جو "مینار پاکستان" کہلاتا ہے۔

"مینار پاکستان" کی لمبائی ساڑھے چھیانوے فٹ ہے۔ جس کے اوپر مختلف مقامات پر قرآنی آیات اور اشعار درج ہیں۔ "مینار پاکستان" کا نقشہ روس کے رہنے والے ایک مسلمان مرات خان نے تیار کیا اور "میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی" نے اس کی تعمیر کی۔

اس مینار کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ پاکستان کے قیام میں پیش آنے والی مشکلات کی عکاسی ہو سکے۔ مثلاً اس کے مختلف چبوترے ہیں جن میں ایک چبوترا بڑا کھردرا اور بغیر کسی تراش خراش کے بنایا گیا ہے یہ چبوترہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ آزادی کے وقت پاکستان کی حالت کس قدر خراب تھی۔

دوسرے چبوترے میں پتھروں کو ترتیب سے لگایا گیا ہے مگر ان میں کھردرا پن موجود ہے یعنی پاکستان اب سنور گیا ہے۔

تیسرے چبوترے میں سب کچھ ختم کر کے ملائمیت پیدا کر دی گئی ہے، مینار کی بنیاد اسی پر قائم ہے یہ ساڑھے تیرہ فٹ اونچے پشتے پر ہے۔

چوتھے چبوترے پر سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلبہ یہ ہے کہ لوگ اب خوشحال ہوگئے ہیں۔ مینار کا آخری سرا پاکستان کی عالمی سربلندی کی علامت ہے۔

مینار کے آخری حصے پر اسٹین لیس اسٹیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس پر سورج کی شعائیں پڑنے سے روشنی کی کرنیں پورے ماحول کو منور کر دیتی ہیں۔

"قرار داد پاکستان" کی پوری عبارت تین مختلف زبانوں یعنی اردو، انگریزی اور بنگالی میں مینار پر درج ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کی مختلف تحریکوں کا بھی مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

جھوٹ

نامعلوم

10 ستمبر 65ء کو "ڈیلی ایکسپریس لندن" نے ایک کارٹون شائع کیا جس میں ایک انگریز دوسرے انگریز سے کہہ رہا تھا "جہاں تک مجھے علم ہے پاکستان کے پاس صرف تین سو جنگی جہاز ہیں مگر بھارتی حکومت کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان کے 470 طیارے گرا چکی ہے" ہاہاہا----

آنکھ مچولی

مرسلہ: محمد سلیم، گوجرخان

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی
چھپ جائیں سب آؤ بھائی
اوپر لے کر ایک رضائی
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

پھول ہیں اس کے پیارے پیارے
اچھے نیارے نیارے
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

آئی ہے اب میری باری
خیر نہیں ہے آج تمہاری
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

کون لئے ہے سر پہ رضائی
کون ہے اس میں بولو بھائی
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

شیر آیا ہے اٹھو اٹھو
سونے والو جاگو جاگو
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

آہا! آہا! آہا! آہا!
ڈھونڈ نکالا، ڈھونڈ نکالا
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

خواب

سعدیہ اسلام، کراچی

سردیوں کے دن تھے۔ رات کو سب کھانا کھا کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے۔ بیٹھے بٹھائے پتہ نہیں کہاں سے کہانی لکھنے کا بھوت ہم پر سوار ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ اگلے مہینے آنکھ مچولی کا خاص نمبر شائع ہو رہا ہے تو کیوں نہ کوئی کہانی لکھ کر بھیجیں۔ خیر جناب ہم نے کاغذ اور قلم لیا اور کہانی لکھنے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ہم نے لکھنا شروع کیا اور کہانی ختم کرنے کے بعد ہم نے اپنا نام، پتہ وغیرہ لکھا اور کہانی ٹیبل پر موجود کتاب کے اندر رکھ دی۔

دوسرے دن اسکول سے واپس آکر ہم نے کہانی پوسٹ کر دی۔ اب ہمیں اگلے مہینے کا انتظار تھا۔ آخر جنوری کا رسالہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ کیا؟ کہانی پر نام تو ہمارا تھا مگر کہانی دوسری تھی۔ خیر ہم نے کہانی پڑھی تو وہ ہماری کہانی سے زیادہ اچھی تھی۔ ہم نے سوچا چلو ہمارا ہی فائدہ ہے۔ دوسرے دن ہم نے اسکول میں اپنے دوستوں کو کہانی دکھائی تو کہانی پڑھتے ہی سب ہنسنے لگے اور کہنے لگے ہمیں بیوقوف سمجھا ہوا ہے۔ یہ کہانی تو پرانے شمارے کی ہے ہم نے خود پڑھی ہے۔ اس وقت ہماری حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟ خیر چھٹی کے بعد گھر آئے اور کچھ سوچ کر ہم نے وہ کتاب دیکھی جس میں ہم نے اپنی کہانی رکھی تھی۔ ہماری کہانی تو کتاب کے اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔ پھر ہمیں سب چکر سمجھ میں آگیا۔ ہوا یوں کہ وہ کتاب ہمارے بڑے بھائی کی تھی جو کہانیاں لکھتے تھے۔ اور وہ کہانی بھی ہمارے بھائی ہی کی تھی جو کہ بہت پرانی تھی اور آنکھ مچولی میں چھپ بھی چکی تھی۔ ہم نے وہ کہانی اپنی سمجھ

کر پوسٹ کر دی۔ اس کہانی کی وجہ سے ہمیں اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ بھی ہونا پڑا۔ خیر ہم نے اس واقعے کو بھلا دیا۔

لیکن اگلے ہی مہینے بلیک لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر ہمارے تو ہوش ہی اڑ گئے اور ہم نے گلا پھاڑ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ امی اور ابو جلدی سے بھاگے ہوئے آئے۔ امی نے ہمیں جھنجھوڑا تو ہماری آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کے لئے ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جب سمجھ میں آیا تو ہم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ یہ سب خواب تھا۔

انسانی جسم اور اس کے کمالات

۱ ..... ایک آدمی کا دل ایک دن میں تقریباً ایک لاکھ ساڑھے سات بار حرکت کرتا ہے۔

۲ ..... ایک بالغ مرد کے جسم میں اتنا فاسفورس ہوتا ہے کہ اس سے دو ہزار ماچس کی تیلیاں بنائی جاسکتی ہیں۔

۳ ..... ایک بالغ انسان پچاس دن میں اپنے وزن کے برابر غذا کھالیتا ہے۔

۴ ..... ایک انسان کا بچہ ہر دس دن میں اتنی غذا کھالیتا ہے جو اس کے وزن کے برابر ہوتی ہے۔

۵ ..... ایک بالغ انسان کی انتڑیاں اس کے قد کی لمبائی سے پانچ گنا زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔

۶ ..... انسان کا جسم ستر حصے پانی اور تیس حصے ٹھوس مادے سے بنا ہے۔

۷ ..... ایک انسان کے منہ کے غدود ایک دن میں تقریباً ۴ / ۱ گیلن لعاب تیار کرتے ہیں۔

۸ ..... انسان کے گردوں میں جو باریک باریک نالیاں ہوتی ہیں ان کی مجموعی لمبائی ۲۸۰ میل ہوتی ہے۔

۹ ..... انسانی جسم میں اتنی چربی موجود ہوتی ہے کہ اوسط درجے کے صابن کی سات ٹکیاں بنائی جاسکتی ہیں۔

۱۰ ..... انسانی جسم میں اتنا لوہا موجود ہوتا ہے جس سے ایک کیل بن سکتی ہے۔

چڑیا گھر کی سیر

ضیغم حمیدی، کراچی

آؤ ہم چڑیا گھر جائیں
خوشیوں سے جھولی بھر لائیں

پہلے جاکر ٹکٹ خریدو
جاکر پھر چڑیا گھر دیکھو

یہ ساری مخلوق ہیں آبی
بطخیں، بگلے اور مرغابی

بن مانس اور بندر دیکھو
ہیں پنجرے کے اندر دیکھو

موڑ کھڑا ہے پَر پھیلائے
ناچ ناچ کر روپ دکھائے

تیتر اور بٹیر بھی دیکھو
افریقہ کا شیر بھی دیکھو

بندر دیکھو چنے چبائے
انسانوں کی نقل بنائے

کتنے ہیں خوش رنگ یہ طوطے
زیبرا، ہاتھی، اونٹ اور چیتے

ایک ٹانگ پہ بگلا کھڑا ہے
سوچ میں گویا ڈوبا پڑا ہے

عمدہ عمدہ دیکھو پرندے
دنیا بھر کے خوفی درندے

دور کھڑا ہے بھالو دیکھو
ناچ رہا ہے کالو دیکھو

آؤ دیکھیں ہاتھی چل کر
سونڈ اٹھاتا ہے وہ سر پر

ہے متوالی چال ہرن کی
تیرتی ہے تالاب میں مچھلی

پنجرے میں وہ ضغیم گرجا
ڈر کے مارے اعظم لرزا

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام _____ کلاس _____

عمر _____ اسکول _____

پتہ _____

_____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____

کلاس _____ پسندیدہ مضمون _____

مستقبل کا خواب _____

اسکول _____

گھر کا پتہ _____

تصویر اس سائز میں ہو۔

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) _____

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

دوستی اللہ کا ایک انمول تحفہ ہے

ساتھی بچوں کے

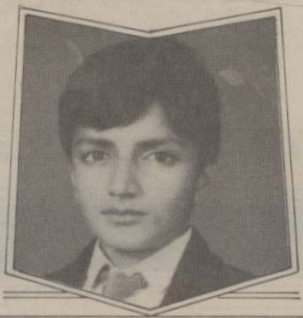

حافظ حامد ۱۳ سال آٹھویں
پسندیدہ مضمون: اسلامیات، سائنس مستقبل کا خواب: ڈاکٹر
تعلیمی ادارہ: نامعلوم
پتہ: ڈاکٹر محمد اصغر گھمن منڈی سمبڑیال ضلع سیالکوٹ

محمد اعجاز ۱۴ سال نہم
پسندیدہ مضمون: بیالوجی مستقبل کا خواب: فوجی افسر
تعلیمی ادارہ: گورنمنٹ ہائی اسکول
پتہ: معرفت ڈاکٹر محمد شریف کھٹہ سگھراں ضلع خوشاب

ممتاز مصطفیٰ ۱۵ سال دہم
پسندیدہ مضمون: انگریزی مستقبل کا خواب: نامعلوم
تعلیمی ادارہ: گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری اسکول
پتہ: مکان نمبر ۱۰۱۳/۵۸ کالج روڈ، دادو، سندھ

چوہدری رضوان احمد گورایہ ۱۲ سال ہفتم
پسندیدہ مضمون: اردو مستقبل کا خواب: پائلٹ
تعلیمی ادارہ: گورنمنٹ اے ڈی ماڈل اسکول
پتہ: دفتر نونہال لیگ، بازار غلام محمد ٹھیکیدار گوجرانوالہ

ساتھی بچپن کے

رضوان عثمان ۱۵ سال نہم
پسندیدہ مضمون: اردو مستقبل کا خواب: کرکٹر
تعلیمی ادارہ: جے ایم اے بوائز سیکنڈری اسکول
پتہ: عامر چیمبر مارکیٹ، اسہراب کٹرک روڈ صدر کراچی

راجہ خالد ۱۶ سال دہم
پسندیدہ مضمون: انگلش مستقبل کا خواب: اداکار بننا
تعلیمی ادارہ: گورنر ابراہیم علی باقی اسکول
پتہ: سیکٹر ایف ۴، آزاد نگر، اورنگی ٹاؤن کراچی

عامر مقبول ۱۳ سال ہفتم
پسندیدہ مضمون: سائنس مستقبل کا خواب: انجینئر
تعلیمی ادارہ: پاکستان ایمبیسی اسکول (جدہ)
پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۵۹۲۵ جدہ، سعودی عرب

محمد علی خان ۸ سال چہارم
پسندیدہ مضمون: حساب مستقبل کا خواب: ایئر فورس
تعلیمی ادارہ: نیو ارل فیلڈ اسکول
پتہ: ۴۴۶ سی پی برار سوسائٹی، فرسٹ فلور کراچی

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ایک غلطی، دو رویّے

کارٹونسٹ کی نظر میں

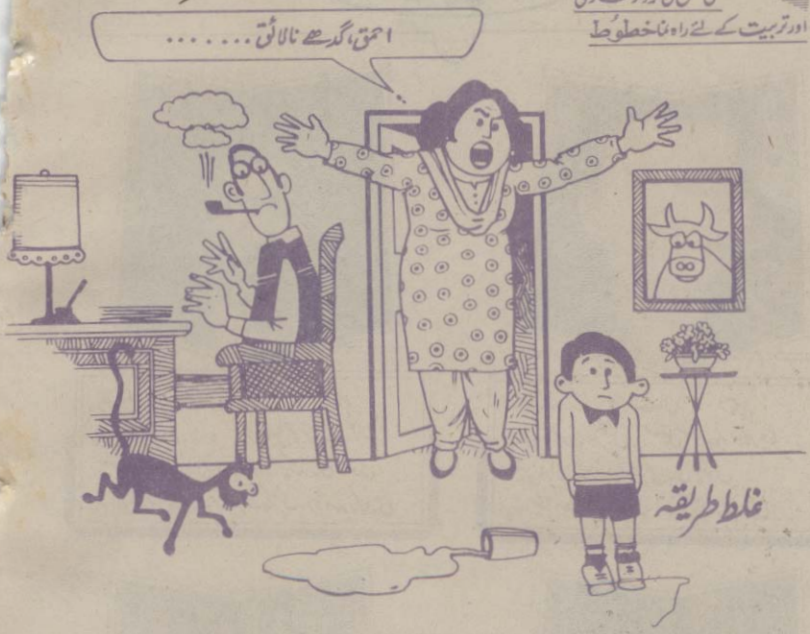

آپ ہی کہیئے کون سا رویّہ بہتر ہے؟

اَب آیا نا سافٹ پیک چائے کا اصل مزہ!

کیوں نہ ہو!
آخر ٹپال پاپولری تو حفظانِ صحت کے عین مطابق آٹومیٹک مشینوں پر تیار ہوتی ہے۔

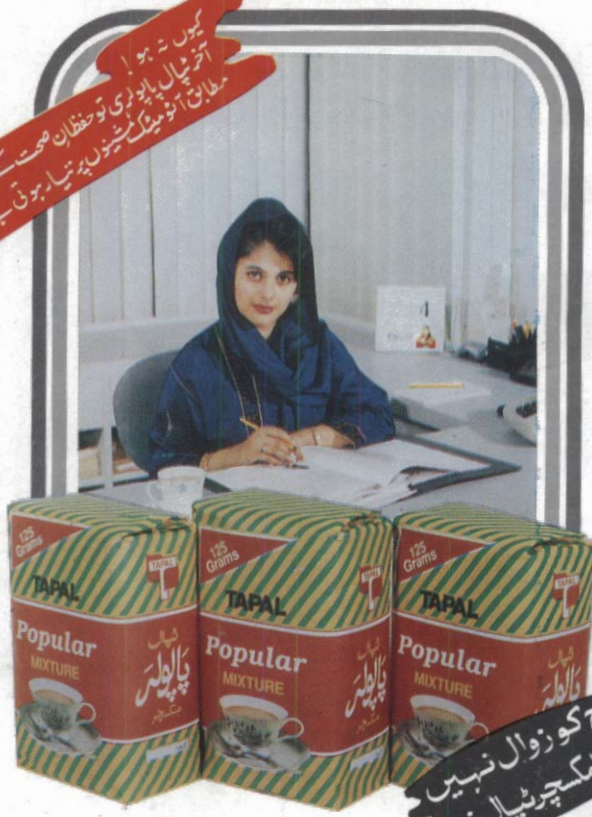

سچ کو زوال نہیں
ہر کینا مکسچر ٹپال نہیں

ہمیشہ اچھی چائے ٹپال ہی بنائے

چائے میں ٹپال کے سالہا سال تجربے کا رنگ اور مہارت کا مزہ

Golden

BLAGH ابلاغ

REGD. No. M-266 MARCH 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

SUPER CRISP

Snacks for all seasons

مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور آب بادام بھی

حفظانِ صحت کے مطابق

ملاوٹ سے پاک

بین الاقوامی معیار کے مطابق

WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY

Tripple Em (Pvt) Ltd.
72/C-I Gulberg III, Lahore. Pakistan
Ph: 871672 - 876396 - 876797
Telex: 44925 MALIK PK
Fax: 042-870-965

EVERNEW CONCEPTS